IMMORTALITY OF THE SOUL

REVD. SULTAN MOHAMMED PAUL

بقائے روح

مولانا پادری سلطان محمد پال صاحب

پنجاب ٹریکٹ سوسائٹی
انارکلی
لاہور

بقائے روح

مصنفہ

مولانا پادری سلطان محمد پال صاحب

سابق پروفیسر عربی۔ فورمن کرسچن کالج لاہور۔

پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی

انارکلی۔ لاہور

سنہ ۱۹۶۸ء

بار دوم

تعداد ۱۰۰۰

نظرِ ثانی

اِس کتاب کی نظرِ ثانی کی گئی ہے۔ یہ کتاب مشہور و معروف عالم و فاضل مولانا پادری سُلطان محمدؐ پال صاحب مرحوم کا نتیجۂ فکر ہے۔ اِس میں رُوحِ اِنسانی کے موضوع پر ایک سیر حاصل بحث کر کے اس کے متعلق مسیحی نظریے کو منقولی و معقولی دلائل و بیانات سے واضح کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں فاضل مُصنّف نے مشرق و مغرب کے بے شمار مُصنّفین کے نظریات و اقوال کو بھی درج کیا ہے۔ ہماری نگاہ میں یہ کتاب بے حد مفید ہے۔

احقر النّاس :-

پادری اصغر فضل الٰہی پال

لٹریچر اسسٹنٹ و مترجم

پی۔ آر۔ بی۔ ایس لاہور

۴۔ مارچ

۱۹۶۸ء

-8736-

فہرست مضامین

حصّہ اوّل	مضامین	صفحات
	بقائے رُوح	۵
	عہدِ جدید یا انجیلِ جلیل	۲۱
	جان یعنی زِندگی کیا ہے؟	۲۹
	زِندگی اَور چیز ہے اَور رُوح اَور چیز	۳۴
	زِندگی کے ارکان	۴۲
	تنفّس	۵۴

حصّہ دوم		
	نابُود شُدہ اقوام اَور رُوح	۶۷
	مَوت کے بعد کیا ہوتا ہے؟	۷۲
	مُردوں کی کِتاب	۸۱

زردشتی مُعتقِدات	۸۵
یُونانیوں کے مُعتقِدات	۸۶
ہنُود کے مُعتقِدات	۹۵
مکالمہ گوتم و ملوکیاپت	۱۰۱
گوتم کی مشہُور مُریدہ کھیما کا لطیفہ	۱۰۱
رُوح کی ماہیّت اَور دماغ کی حقیقت	۱۰۲
دماغ	۱۳۴
اَلحیات بعد الممات	۱۴۳
بائبل مُقدّس اَور حیات بعد الممات	۱۵۴
اَرواح ، بعد از مفارقتِ بدن کہاں رہتی ہیں ؟	۱۶۷

ضمیمہ

جُداگانہ شخصیّت کی قدر و منزلت	۱۷۳
قیامت	۱۷۴

بقائے رُوح

حصّہ اوّل

رُوح کی حقیقت کے متعلق میٹریلزم (Materialism) اور آئیڈیلزم (Idealism) کے دو متضاد مگر غلط خیالات رائج ہیں:-

میٹریلسٹ (مادہ پرست) کہتے ہیں کہ رُوح کوئی چیز نہیں۔ جس کو تم رُوح کہتے ہو وہ دماغ اور اس کے باریک نسوں کے افعال و حرکات کی پیداوار ہے، جو بصورت Gray-matter سطح دماغ پر پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا جب دماغ سڑ جاتا ہے تو رُوح خود بخود مٹ جاتی ہے۔

آئیڈیلسٹ کہتے ہیں کہ مادہ کوئی چیز نہیں۔ حقیقت میں جو کچھ ہے رُوح ہے، لیکن ہر ایک بدن کی جُداگانہ رُوح ہے، جو اسی بدن کے میکانیکی اثرات سے پیدا ہو جاتی ہے۔ جب یہ میکانیکی اثرات زائل ہو جاتے ہیں، تو

لے "The Problem of the Future Life" by A. H. Monelle D.D.

ان کے ساتھ رُوح بھی خُود بخُود معدُوم ہوجاتی ہے۔ گویا کہ یہ فرقہ بھی ایک طرح سائیکالوجسٹ خیالات کے مؤید یا اُن کے قریب ہے۔

لیکن ماہرینِ نفسیات (Psychologist) نے آج تک اس سوال کا کوئی معقُول جواب نہیں دیا کہ اگر رُوح دماغی اثرات کا نتیجہ ہے تو دماغ بھی باقی اعضا کی طرح مادّی ہے، جو ہر روز بلکہ ہر لمحہ تبدیل ہوتا جاتا ہے۔ ایک ذرّہ جاتا ہے اور دُوسرا آتا ہے حتیٰ کہ سات سال کے بعد دماغ اور باقی اعضا سراسر تبدیل ہوجاتے ہیں۔ صرف ایک چیز غیر مبدّل رہتی ہے، جس کو ہم ادراک، تعقل یا کانشس نس (Consciousness) کہتے ہیں۔ اگر ادراک یا تعقل دماغ کا کام ہوتا تو اس کو بھی تبدیل ہونا چاہیئے تھا۔ یعنی ہر شخص سات سال کے بعد اپنے تمام ذہنی و دماغی اندوختہ و پرداختہ کو بھُول جاتا اور یہ بھی تصوّر نہ کرسکتا کہ مَیں وُہی شخص ہُوں، جو سات سال سے پہلے تھا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ایک شخص کا اپنی انانیّت یا خُودی کا ادراک بدستُور قائم رہتا ہے حتیٰ کہ اس کے عادات و خصائص بھی بدستُور قائم رہتے ہیں، جس سے ہم یقینی طور پر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ادراک یا تعقل دماغ کا کام نہیں، بلکہ ایک ایسی چیز کا کام ہے جو غیر مادّی ہو اور دماغ سے بالکل جُداگانہ ہستی رکھتی ہو۔ اسی جُداگانہ ہستی کو ہم رُوح کہتے ہیں۔

پہلے اس سے کہ مَیں رُوح کی مزید تشریح کرُوں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بائبل مقدّس کی روشنی میں رُوح کی حقیقت پر غور کرُوں۔ اس مسئلہ

کے متعلق میں بائبل مُقدّس کو دو حصّوں میں تقسیم کروں گا۔ یعنی (۱) عہدِ عتیق اور (۲) عہدِ جدید اور انہی عُنوانات کے ماتحت اس پر غور کروں گا۔

عہدِ عتیق

بقائے رُوح کے سمجھنے کے لئے ان الفاظ کی تشریح از بس ضروری ہے، جن کا تعلق اس بحث کے ساتھ ہے۔ وُہ الفاظ یہ ہیں :-

(۱) בָּשָׂר (بشر) (۲) נֶפֶשׁ (نفس)

(۳) נְשָׁמָה (نشمہ) (۴) רוּחַ (رُوح)

چند الفاظ اور بھی ہیں جن پر بحث کرنا مناسب تھا، لیکن بہ خوفِ طوالت ان کو چھوڑ دیا گیا۔ آئندہ حسب موقع ان پر بھی بحث کروں گا۔

(۱) بشر۔ نئے عہدنامہ کی رُو سے انسان کا سب سے پہلا جُزو یا حصّہ بشر یعنی گوشت پوست یا جسد ہے جس کو ہم دیکھ سکتے ہیں چھو سکتے ہیں۔ اِس بشریّت یا جسد میں انسان اور حیوان دونوں شریک ہیں اور دونوں پر اس کا اطلاق ہُوا ہے۔ مثلاً پیدائش ۶ : ۱۷ میں بشر کا اطلاق انسان پر ہُوا ہے۔ اور پیدائش ۷ : ۱۵ میں حیوانات پر، لیکن بائبل مُقدّس میں کثرت کے ساتھ ایسی آیات بھی ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کہاں اس کا اطلاق انسان پر ہوتا ہے اور کہاں حیوان پر۔ مثلاً ایوّب ۱۲ : ۱۰ میں بشر کے ساتھ لفظ رُوح کا اِضافہ کیا ہے، جس سے خاص انسان مُراد ہے۔ چنانچہ عربی بائبل کے مُترجمین نے اس کا صحیح ترجمہ یوں

کیا ہے کہ :-

اَلَّذِیْ بِیَدِہٖ نَفْسُ کُلِّ حَیٍّ وَّرُوْحُ کُلِّ الْبَشَرِ یعنی وہ خدا جس کے دستِ قدرت میں تمام زندوں کا نفس ہے اور تمام انسانوں کی رُوح، اس آیت میں نفس کی اضافت سے حیوانات مراد ہیں اور رُوح کی اضافت سے بنی نوع انسان مراد ہے۔ غرضیکہ عہدِ عتیق کی رُو سے انسان کا ایک حصّہ مادی ہے جس کو ہم جسد، جسم اور گوشت پوست وغیرہ ناموں سے نامزد کرتے ہیں۔ عربی میں بھی لفظ بشر انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

(۲) نفس۔ یہ انسان کے اندرونی یا نادیدنی حصّہ کا نام ہے انگریزی بائبل کے مترجمین نے اس کا ترجمہ لفظ (Soul) کیا ہے اور عربی مترجمین نے اس کو بعینہٖ رہنے دیا ہے، کیونکہ یہ لفظ بھی دونوں زبانوں میں مشترک ہے۔ اس کا اطلاق بھی انسان اور حیوان دونوں پر ہوا ہے، لیکن جس کثرت کے ساتھ اس کا اطلاق انسان کے متعلق ہوا ہے، اس کثرت کے ساتھ حیوان کے متعلق نہیں ہوا ہے۔ اس کے اصلی معنی اب تک پردۂ راز میں ہیں بعض لوگ اس کے معنی سانس یا دَم (Breath) کے لیتے ہیں، کیونکہ سانس لینا زندگی کی ایک خاص علامت ہے۔ لیکن یہ

لہ نوٹ :- اس مضمون میں میں نے اکثر عربی بائبل کے حوالے دیئے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ (۱) عبرانی و عربی زبانیں ایک دوسری کے بیحد مماثل ہیں۔ (۲) عربی زبان براہِ راست عبرانی زبان کا ترجمہ ہے اور اس تحقیق کے ساتھ کہ عبرانی کا کوئی لفظ ترجمہ سے نظر انداز نہیں ہوا ہے (۳) عبرانی الفاظ کے معادل جس طرح عربی میں کثرت سے ملتے ہیں، دوسری زبان میں نہیں مل سکتے (مترجم)

ایک قیاسی معنے ہیں نہ کہ تحقیقی کیونکہ اس لفظ کے مختلف مشتقات مختلف معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً خروج ۲۳: ۱۲، ۳۱: ۱۷، و ۲-سموئیل ۱۶: ۱۴ میں اس کے معنی راحت و آرام کرنے کے ہیں۔ صرف ایک جگہ یعنی ایوب ۴۱: ۲۱ میں تنفس کے معنی پہ آیا ہے۔ پس اس لفظ کے مختلف معنوں سے قطع نظر کرکے ہر جگہ اس کے ایک ہی شاذ معنی یعنی سانس یا دم مراد لینا اس لفظ کے معنی نہ سمجھنے کے برابر ہے۔

صرف یہی نہیں بلکہ عہد عتیق میں جان کے معنی پر بھی نہایت کثرت کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً خروج ۲۱: ۲۳ و احبار ۲۴: ۱۸ و قضاۃ ۱۲: ۳ و ۱-سموئیل ۱۹: ۵ و ۲-سموئیل ۱۴: ۷ وغیرہ وغیرہ۔ خون کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً خروج ۹: ۴۔

عربی میں بھی یہ لفظ قریباً قریباً انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے مثلاً:۔

نفس بمعنائے ذات وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ (قرآن مجید)

نفس بمعنائے روح اُخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (قرآن مجید)

نفس بمعنائے دل اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ (قرآن مجید)

نفس بمعنائے شخص یا فرد مثلاً كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (قرآن مجید)

نفس بمعنائے خون سموئیل بن عادیا کہتا ہے کہ:۔

تسیل علی حد الظبات نفوسنا

ولیست علی غیر الظبات تسیل

یعنی ہمارے خون شمشیر کی دھار پر بہتے ہیں شمشیر کی دھار کے

سوا اور کسی چیز پر نہیں بہتے ہیں۔

عہدِ عتیق کے پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نفس ایک ایسی چیز ہے جو آتی بھی ہے اور جاتی بھی ہے۔ مثلاً پیدائش ۳۵: ۱۸ میں راخیل کے متعلق لکھا ہے کہ "جب اُس کا نفس جانے لگا" جس کا ترجمہ اُردو بائبل میں یُوں کیا گیا ہے کہ "جب وُہ مرنے لگی"۔ عربی و انگریزی بائبل میں اس کا صحیح ترجمہ یا ترتیب یُوں ہے کہ "وکان عند خروج نفسها" As her soul was departing نفس کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ ۱سلاطین ۱۷: ۲۱ میں مرقوم ہے کہ جب حضرت ایلیاہ نبی نے ایک بیوہ عورت کے بیٹے کے لئے دُعا کی تو یُوں کہا "اے خُداوند میرے خُدا میں تیری منّت کرتا ہُوں کہ اس لڑکے کی جان (نفس) اس میں پھر آجائے اور خُداوند نے ایلیاہ کی فریاد سُنی اور لڑکے کی جان (نفس) اُس میں پھر آگئی اور وُہ جی اُٹھا"

نیز نفس کی ایک اور عجیب خاصیت کا بیان ہُوا ہے کہ وُہ مساس اور محسوس ہونے کی قابلیت رکھتا ہے۔ چنانچہ نابال کی بیوی ابیجیل حضرت داؤد سے کہتی ہے کہ "اور گو انسان تیرا پیچھا کرنے اور تیری جان (نفس) لینے کو اُٹھے تو بھی میرے مالک کی جان (نفس) زندگی کے بقچہ[1] میں خُداوند تیرے خُدا کے ساتھ بندھی رہے گی پر تیرے دشمنوں کی جانیں (نفس) وُہ فلاخن میں رکھ کر پھینک دے گا" (۱سموئیل ۲۵: ۲۹-۳۰)

(۳) **نسمہ**:- اگر آپ پیدائش کی کتاب ۱: ۲۰-۲۵ کو غور سے پڑھیں تو آپ چرندے اور پرندے اور دیگر حیوانات کی پیدائش کے

متعلق یہ جملے پائیں گے یہ اور خدا نے کہا کہ پانی جانداروں (نفسِ حیا) کو کثرت سے پیدا کرے اور پرندے (عوف) زمین کے اوپر فضا میں اڑیں۔ ان کی جنس کے موافق چوپائے اور رینگنے والے جاندار اور جنگلی جانور ان کی جنس کے موافق پیدا کرے۔" ان آیات میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ تمام حشرات الارض اور طیور اور وحوش کی زندگی کو لفظ نفس سے تعبیر کیا ہے اور اس لفظ نفس کو خدا نے پانی اور زمین کی طرف منسوب کیا ہے لیکن اسی کتاب کے باب دوم میں جب انسان کی پیدائش کا ذکر کرتا ہے تو اس طریقہ سے کرتا ہے کہ انسان اور دیگر حیوانات میں زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے کہ :-

جبل الرّب الالٰہ آدم ترابًا من الارض و نفخ فی انفہ نسمۃ حیوۃ فصار آدم نفساً حیۃً (آیت) اس آیت میں خدا حضرت آدم کے متعلق دو باتوں کا ذکر کرتا ہے۔ اوّل یہ کہ خدا نے خود آدم کو بنایا۔ دوم کہ "خدا نے آدم کے نتھنوں میں نسمہ پھونکا" جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نفس اور نسمہ میں ایک لطیف فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا نفس کو نہیں بلکہ نسمہ کو اپنی طرف نسبت دیتا ہے۔

آیاتِ مافوق میں نفس کے معنی صرف زندگی کے لئے جا سکتے ہیں اور نسمہ کے معنی روح کے کیونکہ تعقل و ادراک کا سرچشمہ یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے باقی تمام حیوانات وغیرہم کو حضرت آدم کے سامنے پیش کیا کہ ان کا نام رکھ دیں۔ چنانچہ آدم ہی نے اُن کا نام نفسِ حیا یعنی جاندار رکھ

دیا اور اسی نسمہ ہی کی وجہ سے خدا نے آدم کو سب کا سردار مقرر کیا۔ (پیدائش ۱: ۲۶ و ۲: ۱۹-۲۰)

میں نے نسمہ کے معنی رُوح کے لئے ہیں اور اس کی وجہ یہ بتلائی کہ نسمہ عقل و ادراک کا سرچشمہ ہے۔ چنانچہ ہم عہد عتیق کے چند مقامات اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں :-

(۱) ولکن فی الناس روحًا ونسمۃ القدیر تعقّلہم - (ایوب ۳۲: ۸)

(۲) روح اللہ صنعنی ونسمۃ القدیر احیتنی - (ایوب ۳۳: ۴)

(۳) لمن اعلنت اقوالًا ونسمۃ من خرجت منک - (ایوب ۲۶: ۴)

ان آیات کا ترجمہ بالترتیب از قرارِ ذیل ہے :-

(۱) لیکن انسان میں رُوح ہے اور قادرِ مطلق کا نسمہ عقل بخشتا ہے۔ (ایوب ۳۲: ۸)

(۲) خدا کی رُوح نے مجھے بنایا ہے اور قادرِ مطلق کا نسمہ مجھے زندگی بخشتا ہے۔ (ایوب ۳۳: ۴)

(۳) جو (عقل کی باتیں) تُو نے کہیں سو کس سے اور کس کا نسمہ تجھ میں سے نکلا۔ (ایوب ۲۶: ۴)

عربی زبان میں بھی لفظ نسمہ رُوح کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آنحضرت فرماتے ہیں کہ "لما خلق اللہ آدم مسح ظہرہ فسقط عن ظہرہ کل نسمۃ[۱] ہو خالقہا من ذریتہ

---

[۱] ابن قیم جوزی نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "الروح" میں بہت سی احادیث نقل کی ہیں جن میں نسمہ رُوح کے معنوں میں آیا ہے۔ خاص کر "المسئلۃ الخامسۃ عشر" دیکھنے کے قابل ہے۔

الیٰ یوم القیمۃ الخ

یعنی جب خُدا نے آدم کو خلق کیا، تو اُس کی پیٹھ کو چھُوا تو اُس کی پیٹھ سے وُہ تمام رُوحیں جن کو وُہ قیامت تک پیدا کرنا چاہتا تھا ٹپکنے لگیں الخ۔ مَیں نے اس حدیث کو پُورے طور سے اپنے رسالہ "مَیں کیوں مسیحی ہوگیا" میں نقل کیا ہے، وہاں اس کی تفصیل دیکھ لیجئے۔

(۴) رُوح - رُوح کے لغوی معنی ہَوا کے ہیں۔ عربی میں اس کے یہی لغوی معنی ہیں۔ چنانچہ حضرت معاویہ کی اہلیہ محترمہ جو ایک بادیہ نشین عورت تھی، اور دیہات کی آزادانہ اور نہایت سیدھی سادی زندگی کو شاہی محلات اور غیر فطری شان و شوکت پر ترجیح دیتی تھیں کہتی ہیں کہ :-

لَبیتٌ تخفقُ الارواحُ فیہ
اَحبُّ الیَّ من قصرٍ مُنیفٍ

یعنی مجھے وُہ گھر محبُوب ہے جس میں چاروں طرف سے ہَوا آتی ہے بہ نسبت اُس قصر کے جو بہت بلند یعنی عالی شان ہو۔

لفظ رُوح کا اطلاق بائبل مُقدّس میں خُدا پر بھی ہوا ہے (پیدائش ۱: ۲) اور انسان کے اس غیر مرئی اور غیر مادّی حصّہ پر بھی جس کو ہم رُوح کہتے ہیں، جس میں انانیت ادراک اور تعقّل ہے۔ شدید تعلق کی رُو سے نفس کا تعلق خُون کے ساتھ ہے، لیکن رُوح کا تعلق

تمام بدن کے ساتھ ہے۔ رُوح خُدا کی دی ہُوئی چیز ہے۔ یہ بدن کے ساتھ فنا نہیں ہوتی ہے، بلکہ بدن سے جُدا ہونے کے بعد خُدا کے پاس باقی رہتی ہے۔

یسعیاہ نبی فرماتے ہیں کہ "اِلیٰ اسمك واِلیٰ ذکرك شهوة النفس بنفسی اشتهیتك فی اللیل۔ ایضاً بروحی فی داخلی الیك ابتکر" (۲۶ : ۹) یعنی ہماری جان (نفس) کا اشتیاق تیرے نام اور تیری یاد کی طرف ہے۔ رات کو میری جان (نفس) تیری مشتاق ہے۔ ہاں میری رُوح تیری جُستجُو میں کوشاں رہے گی۔" نیز ایوب ۳۲ : ۸ و ۳۳ : ۴ ملاحظہ ہوں۔

غرضیکہ رُوح کی تعریف اور اس کے افعال واوصاف اس خُوبصُورتی کے ساتھ عہدِ عتیق میں بیان ہُوتے ہیں جن کو پڑھ کر ایک کُند ذہن شخص بھی رُوح کی حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا ہے۔

لیکن قارئین یہ پڑھ کر حیران ہوں گے کہ مسیحوں میں بھی بہت تھوڑے عرصے (۱۸۴۴ء) سے ایک ایسا فرقہ پیدا ہُوا ہے جو رُوح کی ہستی سے انکار کرتا ہے۔ اس فرقہ کا نام سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ[1] یعنی Seventh-Day Adventists ہے۔ اس فرقہ کے چند ایسے عقائد ہیں جو بائبل مُقدّس کی تعلیم کے سراسر منافی ہیں۔ وُہ عقائد از قرار

---

[1] اس فرقہ کی بانیہ ایک خاتون تھی جس کا نام مس ہارمن تھا۔ ۲۵ سال کی عُمر ۱۸۴۶ء میں مسٹر جیمس وہائٹ کے ساتھ شادی کی اَور مسز وہائٹ کہلانے لگی۔ (منہ)

ذیل ہیں :-

(۱) رُوح بدن سے علیحدہ کوئی ہستی نہیں رکھتی -

(۲) رُوح دماغی حرکات کا نام ہے -

(۳) انسان اور حیوان میں ایک ہی رُوح[لہ] ہے -

(۴) جب اِنسان مرتا ہے تو رُوح بھی مرجاتی ہے -

(۵) مرنے کے بعد نہ تو نیکوکاروں کی اَرواح جنّت میں جاتی ہیں اور نہ ہی بدکاروں کی اَرواح دوزخ میں جاتی ہیں، بلکہ اپنی اپنی قبروں میں بے حسی کی حالت میں قیامت تک پڑی رہیں گی -

(۶) قیامت میں عدالت کے بعد خُدا شریروں کی اَرواح کو بالکل فنا کردے گا -

(۷) خُداوند کی رُوح بھی تین دِن تک قبر میں پڑی رہی تھی اور آسمان پر نہیں گئی تھی - (ملاحظہ ہو)

Bible Reading for the Home Reading Circle
pp. 107-110
Belief and Work of Seventh Day Adventists
pp. 83—85
(Helps to Bible Study pp. 32 and 33)

لہ خُدا کا شکر ہے ہماری اس کتاب کے "اُخوت" میں شائع ہونے کے ساتھ ہی اس فرقہ کے خیالات میں ایک خوشگوار انقلاب پیدا ہونے لگا ہے - چنانچہ اس کتاب کی اشاعت سے پہلے ان کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان اور حیوان میں ایک ہی رُوح ہے" لیکن حال ہی میں جو ہڑ کانہ منڈی ضلع شیخوپورہ سے ان کا ایک رسالہ شائع ہوا ہے جس کا نام "رسالہ مبشر" ہے اس رسالہ میں پہلے عقیدہ سے رجوع کیا ہے اور اب ان کے نزدیک نباتات اور حیوانات میں وہ رُوح نہیں ہے جو انسان میں ہے - چنانچہ اس کی عبارت یہ ہے کہ "درندوں اور پرندوں کے اجسام ہیں لیکن ان میں وہ رُوح موجود نہیں جیسی کہ انسانوں میں پائی جاتی ہے" (ص ۲۷) -

بائبل کی تعلیم[1] ص۱۴۵ ۔ ص۱۵۶

مَیں ان مسائل کی ہر ایک شق پر برموقع علیحدہ علیحدہ بحث کروں گا ۔ اس بحث میں صرف شقِ اوّل پر بحث کی جائے گی ۔

شقِ اوّل ۔ رُوح کے متعلق اس فرقہ کا عقیدہ خُود انہیں کے الفاظ میں از قرارِ ذیل ہے :۔

" خُدا نے اس کے (آدم کے) نتھنوں میں کیا پھُونکا ؟"

اس کے نتھنوں میں " زندگی کا دم " پھُونکا ۔ اس کا نتیجہ کیا ہُوا ؟ پس آدم جیتی جان ہُوا " (بائبل کی تعلیم ص۱۴۵)

اب " زندگی کے دم " کی تفسیر و تشریح ملاحظہ ہو جو اسی کتاب کے اسی صفحہ میں کرتے ہیں ۔ لکھتے ہیں کہ :۔

نوٹ :۔ " جس کو زندگی کا دم کہا گیا ہے اس میں بذاتِ خاص نہ تو کسی قسم کی ہستی یا وجُود تھا نہ اس میں خُود سوچنے یا خیال کرنے کی قوت تھی ۔ وُہ محض زندگی کا جوہر اَور حیات کا لبِ لُباب تھا جس سے کہ ہم سب زندہ رہتے ہیں ۔ وُہی زندگی کا دم جب تک کسی شے میں رہتا ہے وُہ شے جیتی جاگتی رہتی ہے اَور جب وُہ اس میں سے نکل جاتا ہے تو وُہ شے بے حس و حرکت ہو جاتی ہے ۔ گو انسان کو زندگی کا دم عنایت ہُوا مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وُہ حیاتِ اَبدی حاصل کر بیٹھا یا فنا سے کنارہ کش ہو کر بقا کا مالک بن بیٹھا ۔ اس کو خوب یاد رکھئے کہ انسان فانی ہے اَور

---

[1] یہ تمام کتابیں خُود اسی فرقہ کی مستند تصانیف ہیں ۔ (منہ)

جس طرح اس کا جسم فنا ہونے والی شے ہے، اسی طرح وہ زندگی کا دم بھی اس میں ناپید ہو جاتا ہے۔"

اسی عقیدہ کو ان کا ایک امریکن مصنف یوں دہراتا ہے کہ :-

At death the body goes back to dust, the spirit returns to God who gave it. This spirit which returns to God is not sum entity which is capable of a conscious existence apart from the body but it is breath of body.
(Helps to Bible Study p. 32)

یعنی "موت کے وقت بدن خاک میں پھر مل جاتا ہے، اور روح جسے خدا نے دیا تھا خدا کے پاس لوٹ جاتی ہے۔ اس روح کا جو خدا کے پاس لوٹ جاتی ہے، بدن سے علیحدہ نہ تو کوئی وجود ہے نہ ادراک ہے نہ ہستی ہے۔ یہ صرف زندگی کا دم ہے۔"

جس لفظ کا ترجمہ انہوں نے "زندگی کا دم" کیا ہے وہی لفظ "نسمہ" ہے، جس پر ہم بحث کر آئے ہیں اور بتلا چکے ہیں کہ روح اور نسمہ دونوں مترادف الفاظ ہیں۔ دونوں ایک ہی معنی پر دلالت کرتے ہیں۔ (ایوب ۳۲: ۸ و ۳۳: ۴)۔

سنیچر مشن والوں کو اس لفظ کے لغوی یعنی لفظی معنی کی وجہ سے ٹھوکر لگی ہے کیونکہ اس کے بہت سے معنی ہیں اور ان معنوں میں ایک معنی دم (Breath) کے بھی ہیں۔ چنانچہ عربی میں بھی لفظ نسیم اسی سے مشتق

ہے جس کے معنی فرحت بخش یا صبح کی ہوا کے ہیں۔ چنانچہ امرء القیس اپنے
معلقہ میں کہتا ہے ؎

اِذا قامتا تضوّع المسك منهما
نسیمُ الصّبا جاءت بریّا القرنفل

یعنی جب میری محبوبہ اُٹھتی ہیں تو مشک کی خوشبو اُن سے ایسی نکلتی تھی جیسے صبح کی ہوا لونگ کی خوشبو پہنچائے۔" لیکن دم کے معنی یہ کرنا کہ "جس کا کوئی وجود نہ ہو، ہستی نہ ہو۔ ان میں پڑھنے اور خیال کرنے کی قوت" نہ ہو" سراسر غلط اور مہمل ہے۔ کیونکہ اگر "دم" کی "ہستی" اور "وجود" نہیں ہے اور "دم" کوئی چیز نہیں ہے تو وہ زندگی اور تعقل کس طرح بخش سکتا ہے اور ہم ثابت کر آئے ہیں کہ "نسمہ" زندگی و تعقل کا سرچشمہ ہے۔ ملاحظہ ہو اسی کتاب کے شروع میں بحث "نسمہ"۔

سینیچر مشن والوں کو اس من گھڑت اور طبع زاد تاویل کی کہ "جس کو زندگی کا دم کہا گیا ہے اُس میں بذاتِ خاص نہ تو کسی قسم کی ہستی یا وجود تھا نہ اس میں خود سوچنے یا خیال کرنے کی قوت تھی۔" ضرورت اس سے لاحق ہوئی کہ واعظ کی کتاب میں جس کا حوالہ خود اُنہوں نے دیا ہے ایک عجیب جملہ واقع ہوا ہے جو اُن کے اس عقیدہ کی تخریب کے لئے تنہا کافی ہے۔ وہ آیت یہ ہے:۔

"اور خاک خاک سے جا ملے، جس طرح آگے ملی ہوئی تھی اور رُوح

خُدا کے پاس جس نے اُسے دیا تھا واپس جائے" (۱۲: ۷) اس آیت میں انسان کے دو حصّوں کا ذکر ہے، ایک خاکی یعنی مادی جو اپنی جنس سے مل جاتا ہے۔ دُوسری رُوح یعنی ایک غیر مادی چیز جو اپنے خالق کی طرف جو غیر مادی ہے لوٹ جاتی ہے۔ اِس آیت کے حصّہ دوم سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ (۱) رُوح ایک چیز ہے یعنی ہستی اور وجُود کی مالک ہے جس کو خُدا نے دیا ہے اور اگر رُوح صاحبِ ہستی اور وجُود نہ ہوتی تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر خُدا نے کیا دیا تھا؟ یعنی کچھ نہیں۔ (۲) یہ کہ رُوح صاحبِ ادراک ہے۔ وُہ اپنے خالق کو پہچانتی ہے۔ اس لئے اپنے خالق کے پاس جاتی ہے۔ اگر اس میں ادراک نہ ہوتا تو خُدا کے پاس جانے کی کیا ضرورت تھی؟ اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتی۔ جب اس فرقہ نے دیکھا کہ اس آیت سے تو ہمارے عقیدہ پر پانی پھر جاتا ہے تو جھٹ کہنے لگے کہ "رُوح کا جو خُدا کے پاس لوٹ جاتی ہے بدن سے علیحدہ نہ تو کوئی وجُود ہے نہ ادراک ہے نہ ہستی"۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ فرقہ صرف inhalation یعنی عمل تنفس کا قائل اور نتیجۃً مادہ پرستوں کی اُس شاخ سے مل جاتا ہے جس کو Annihilationism کہتے ہیں۔ اس فرقہ کا عقیدہ یہ ہے کہ بدن کے ساتھ رُوح بھی فنا ہو جاتی ہے۔

اِس مضمون پر جہاں علم النفس Psychology اور علم حیات (Biology) کی رُو سے رُوح پر بحث کروں گا زیادہ روشنی ڈالوں گا۔

یہاں صرف بائبل مقدس کی رُو سے بحث ہے۔

اگر آپ بائبل مقدس کی اُن آیتوں کو پھر ایک بار پڑھیں جن کو میں نے لفظ رُوح کے تحت نقل کیا ہے تو آپ کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ حقیقت میں پُرانے عہدنامہ کی رُو سے رُوح بدن سے ایک جُداگانہ چیز ہے جس کا وجُود اور ہستی مستقل ہے جو صاحبِ ادراک ہے اور غیر مادی ہے اور بدن کے ساتھ فنا نہیں ہوتی، بلکہ موت کے بعد قائم اور دائم رہتی ہے اور اگر ذیل کی آیات کو بھی اُن آیتوں کے ساتھ ساتھ مطالعہ کریں تو پھر رُوح کی جُداگانہ ہستی اور وجُود کے متعلق کسی قسم کا شک وشبہ آپ کے ذہن میں باقی نہیں رہ سکتا۔

(۱) "تب وُہ مُنہ کے بل گر کر کہنے لگے، اے خُدا سارے بشر کی رُوحوں کے خُدا! کیا ایک آدمی کے گُناہ کے سبب سے تیرا قہر ساری جماعت پر ہوگا؟" (گنتی ۱۶ : ۲۲)

(۲) "اِنْ جَعَلَ عَلَيْهِ قَلْبَهُ اِنْ جَمَعَ نَفْسَهُ وَرُوْحَهُ وَنَسَمَتَهُ يَسْتَلِمُ الرُّوحَ كُلَّ بَشَرٍ جَمِيعًا وَيَعُوْدُ الْاِنْسَانُ اِلَى التُّرَابِ" (ایوب ۳۴ : ۱۴-۱۵)

یعنی "اگر وُہ انسان سے اپنا دل لگائے۔ اگر وُہ اپنی رُوح اور نسمہ (دَم) کو واپس لے لے تو تمام بشر اکٹھے فنا ہو جائیں گے۔" (ایوب ۳۴ : ۱۴-۱۵)

آیت نمبر ۱ میں "بشر کی رُوحوں" میں اضافت ہے یعنی "البشر"

مضاف الیہ اور " رُوحوں " مضاف ہے۔ مضاف الیہ اور مضاف میں مغائرت ضروری ہے، ورنہ اضافت مہمل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا "بشر" علیحدہ چیز ہے اور " رُوح " علیحدہ چیز جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ رُوح ایک مستقل وجود اور ہستی رکھتی ہے۔

آیت نمبر ۲ میں رُوح و نسمہ کے درمیان جو واو ہے، وہ حرفِ تفسیر ہے۔ یعنی رُوح مُفسَّر اور نسمہ اس کی تفسیر ہے۔ اور دونوں کو خُدا اپنی طرف نسبت دیتا ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ رُوح یا نسمہ غیر مادی ہے، کیونکہ خُدا خُود غیر مادّی ہے۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ "بشر"[1] انسان کا مادی حصہ ہے اور رُوح غیر مادّی حصہ ہے تو نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ رُوح ایک جُداگانہ مستقل شے ہے اور جسد (بشر) ایک جُداگانہ شے ہے۔ پس یہ کہنا کہ "بدن سے علیحدہ رُوح کی کوئی ہستی یا وجُود نہیں "ہے"، سراسر بے خبری ہے۔

عہدِ جدید یا انجیلِ جلیل

انجیلِ جلیل میں رُوح کے متعلق ایسی واضح اور صریح تعلیم موجُود ہے جس کو ایک بار پڑھ کر پھر کوئی شخص خواہ وُہ کیسا ہی جاہل کیوں نہ ہو، رُوح کی ہستی سے اِنکار نہیں کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس بحث میں ہم صرف اِنہی آیات کو نقل کریں گے، جن سے رُوح کا بدن سے جُداگانہ وجُود ثابت ہوتا ہے اور پھر مختلف مباحث میں ہر بحث کے موضوع و مضمون

[1] اس لفظ پر ہم بحث کر چکے ہیں۔ (مصنف)

کے مطابق اُن آیات کو نقل کریں گے، جو اس مضمون کے موافق ہوں گی۔

انجیلِ جلیل نے بھی عہدِ عتیق کی مطابقت میں انسان کو (۱) مادی اور (۲) غیر مادی حصّوں میں تقسیم کیا ہے، اور ہر حصّہ کو ایک مستقل ہستی تسلیم کیا ہے۔ صرف فرق یہ بتلایا ہے کہ مادی حصّہ فانی اور مٹنے والا ہے اور غیر مادی حصّہ لافانی اور نہ مٹنے والا ہے۔ مثلاً

(۱) جسم فانی ہے

"اور اگر اُسی کا رُوح تم میں بسا ہُوا ہے جس نے یسُوع کو مُردوں میں سے جِلایا، تو جس نے مسیح یسُوع کو مُردوں میں سے جِلایا، وُہ تمہارے فانی بدنوں کو بھی اپنے رُوح کے وسیلے سے زِندہ کرے گا، جو تم میں بسا ہُوا ہے" (رُومیوں ۸: ۱۱)

"کیونکہ ضرور ہے کہ یہ فانی جسم بقا کا جامہ پہنے اور یہ مرنے والا جسم حیاتِ اَبدی کا جامہ پہنے" (۱۔کرنتھیوں ۱۵: ۵۳)

"اور جب یہ فانی جسم بقا کا جامہ پہن چکے گا اور یہ مرنے والا جسم حیاتِ اَبدی کا جامہ پہن چکے گا، تو وُہ قول پُورا ہوگا جو لکھا ہے کہ موت فتح کا لُقمہ ہو گئی" (۱۔کرنتھیوں ۱۵: ۵۴)

"پس گُناہ تمہارے فانی بدن میں بادشاہی نہ کرے کہ تم اُس کی خواہشوں کے تابع رہو" (رُومیوں ۶: ۱۲)۔

(۲) جسم مرتا ہے

آیاتِ مافوق سے نہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ بدن یعنی جسم فانی ہے، بلکہ یہ بھی کہ جسم یا بدن ہی مرتا ہے۔ ان کے علاوہ ذیل کی آیتیں ملاحظہ ہوں۔

"جسم فنا کی حالت میں بویا جاتا ہے اور بقا کی حالت میں جی اُٹھتا ہے"۔
(۱۔کرنتھیوں ۱۵: ۴۲)۔

"ہائے میں کیسا کمبخت آدمی ہوں! اس موت کے بدن سے مجھے کون چھڑائے گا؟" (رومیوں ۷: ۲۴)

اب اس امر کے لئے کہ بدن کی موت سے کیا مراد ہے۔ یا بدن کس طرح مرتا ہے۔ ذیل کی آیت ملاحظہ ہو:۔

"غرض جیسے بدن بغیر روح کے مُردہ ہے، ویسے ایمان بھی بغیر اعمال کے مُردہ ہے"۔ (یعقوب کا خط ۲: ۲۶)

یعنی روح کا بدن سے علیحدہ ہونے کا نام موت ہے، اور جس سے روح جدا ہو جاتی ہے وہ مُردہ کہلاتا ہے۔

(۳) روح

اب انجیل جلیل یہ تعلیم دیتی ہے کہ انسان میں صرف بدن ہی بدن نہیں ہے بلکہ اس میں ایک اور مستقل چیز رہتی ہے جس کو روح کہتے ہیں۔ ذیل کی آیات ملاحظہ ہوں:۔

"جو بدن کو قتل کرتے ہیں اور روح کو قتل نہیں کر سکتے، اُن سے نہ ڈرو۔ بلکہ اُسی سے ڈرو جو روح اور بدن دونو کو جہنم میں ہلاک کر سکتا ہے"۔ (متی ۱۰: ۲۸)

اس آیت میں نہ صرف خداوند یہ تعلیم دیتے ہیں کہ روح بدن سے علیحدہ ہستی اور وجود رکھتی ہے بلکہ یہ بھی بتلاتے ہیں کہ روح ایک غیر مادی چیز ہے اور بدن کی موت سے متاثر نہیں ہوتی۔ اگر روح دماغی افعال و حرکات کا نتیجہ ہوتی تو یقیناً بدن کے صدمات سے متاثر ہو جاتی اور بدن کی موت

کے ساتھ مرجاتی جس طرح کہ موت کے ساتھ ساتھ دماغ بھی مرکر خاک ہو جاتا ہے۔

"میں اپنی رُوح تیرے ہاتھوں میں سونپتا ہوں" (لوقا ۲۳: ۴۶)

- اگر رُوح کی کوئی ہستی یا وجود نہیں ہے، تو "خُدا کے ہاتھوں میں سونپنے" کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟ بجز اس کے کہ معاذ اللہ خُدا کے ہاتھوں میں ایک معدوم محض کو سونپ دیا۔

مُقدّس اِستفنس شہادت کے وقت فرماتے ہیں کہ:-

"اے خُداوند یسُوع! میری رُوح کو قبول کر" (اعمال ۷: ۵۹)

"رُوح خود ہماری رُوح کے ساتھ مل کر گواہی دیتا ہے کہ ہم خُدا کے فرزند ہیں" (رُومیوں ۸: ۱۶)

اس آیت میں پہلی رُوح سے مُراد رُوح القُدس ہے۔ اسی لئے اس کو ہمیشہ مذکّر کے صیغہ میں لکھتے ہیں اور دُوسری رُوح جس کو ہمیشہ مؤنث لکھتے ہیں ہماری رُوح مُراد ہے۔

"کیونکہ انسانوں میں سے کون کسی انسان کی باتیں جانتا ہے سوا انسان کی اپنی رُوح کے جو اس میں ہے" (۱-کرنتھیوں ۲: ۱۱)

اس آیت میں دو باتیں بتلائی گئی ہیں، ایک تو یہ کہ وہ صاحبِ علم ہے اور دوم یہ کہ رُوح اِنسان میں ایک مستقل چیز ہے۔

مُقدّس پولُس ایک بدکردار مسیحی کے متعلق فرماتے ہیں کہ:-

"وہ جسم کی ہلاکت کے لئے شیطان کے حوالے کیا جائے تاکہ اُس کی

رُوح خُداوند یسُوع کے دِن نجات پائے۔" (۱۔کرنتھیوں ۵:۵)

مُقدّس پَولُس شادی شُدہ و ناشادی شُدہ عورتوں کے مُتعلق فرماتے ہیں کہ :-

"بیاہی اَور بے بیاہی میں بھی فرق ہے۔ بے بیاہی خُداوند کے فکر میں رہتی ہے تاکہ اُس کا جسم اَور رُوح دونوں پاک ہوں۔"

مُقدّس پَولُس نے "دونوں" کہہ کر جسم اَور رُوح دونوں کو علیٰ حدہ ذاتہ ثابت کر دیا۔

"علاوہ اس کے کہ جب ہمارے جسمانی باپ ہمیں تنبیہ کرتے تھے اَور ہم اُن کی تعظیم کرتے رہے تو کیا رُوحوں کے باپ کی اس سے زیادہ تابعداری نہ کریں جس سے ہم زندہ رہیں؟" (عبرانیوں ۹:۱۲)

اگر رُوحوں کی کوئی ہستی یا وجُود نہیں ہے تو خُدا کو "رُوحوں کے باپ" کہنا غلط ٹھہرتا ہے۔

اب مَیں دو آیتیں اس قسم کی پیش کرتا ہُوں جن سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اِنسان میں جسم اَور رُوح کے علاوہ ایک تیسری چیز بھی ہے، جس کو جان کہا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

"خُدا جو اطمینان کا چشمہ ہے آپ ہی تُم کو بالکل پاک کرے اَور تُمہاری رُوح اَور جان اَور بدن ہمارے خُداوند یسُوع مسیح کے آنے تک پُورے پُورے بے عیب محفوظ رہیں۔" (۱۔تھسلنیکیوں ۲۳:۵)

"کیونکہ خُدا کا کلام زندہ اَور مؤثر اَور ہر ایک دودھاری تلوار سے زیادہ

تیز ہے اُور جان اُور رُوح اُور بند بند اُور گُودے گُودے کو جُدا کر کے
گزر جاتا ہے۔" (عبرانیوں ۴: ۱۲)

مَیں نے گذشتہ صفحات میں اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بائبل مُقدّس کے دونوں حِصّوں نے اِنسان کو دو حِصّوں میں یعنی مادی اور غیر مادی میں تقسیم کیا۔ مادی حِصّہ کو پھر چند بُنیادی اجزا میں تقسیم کیا ہے۔ مثلاً:-

(۱) بشر یعنی گوشت پوست جس کا بیان ہو چکا ہے۔ اب ہم چند اَور حِصّوں کا بیان حوالہ قلم کرتے ہیں:-

(۲) דָּם دم یعنی خُون - جس کو زندگی کا حامل کہا گیا ہے اَور جس کے کھانے کی سخت ممانعت کر دی گئی ہے۔ ذیل کی آیات ملاحظہ ہوں۔

"اَور اسرائیل کے گھرانے کا یا اُن پردیسیوں میں سے جو اُن میں بُود و باش کرتے ہیں جو کوئی کسی طرح کا خُون کھائے، مَیں اُس خُون کھانے والے کے خلاف ہُوں گا۔ اَور اُسے اُس کے لوگوں میں سے کاٹ ڈالُوں گا، کیونکہ جسم کی جان خُون میں ہے اَور مَیں نے مذبح پر تُمہاری جانوں کے کفّارہ کے لئے اُسے تُم کو دیا ہے کہ اُس سے تُمہاری جانوں کے لئے کفّارہ ہو۔ کیونکہ جان رکھنے ہی کے سبب سے خُون کفّارہ دیتا ہے۔ اسی لئے مَیں نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تُم میں سے کوئی شخص خُون کبھی نہ کھائے اَور نہ کوئی پردیسی جو تُم میں بُود و باش کرتا ہے۔ کبھی خُون کو

---

۱ خُون کو بیولاجیکل بیان آگے آئے گا۔ (مصنف)

کھائے اور بنی اسرائیل میں سے یا اُن پردیسیوں میں سے جو ان میں بُود و باش کرتے ہیں جو کوئی شکار میں ایسے جانور یا پرندے کو پکڑے جس کا کھانا حلال ہے تو وُہ اُس کے خُون کو نکال کر مٹی سے ڈھانک دے کیونکہ جسم کی جان جو ہے وُہ اس کا خُون ہے، جو اس کی جان کے ساتھ ایک ہے۔ اسی لئے میں نے بنی اسرائیل کو حُکم دیا ہے کہ تُم کسی قسم کے جانور کا خُون نہ کھانا، کیونکہ ہر جانور کی جان اُس کا خُون ہی ہے۔ جو کوئی اُس کو کھائے وُہ کاٹ ڈالا جائے" (احبار ۱۷: ۱۰-۱۴) نیز دیکھو پیدائش ۹: ۴-۵۔ یرمیاہ ۲: ۳۴۔ احبار ۳: ۱۷ و ۷: ۲۶۔ استثنا ۱۲: ۱۶ و ۲۳ و ۲۴ وغیرہ۔

(۳) עצם یعنی ہڈی جس کو عربی میں بھی عظم کہتے ہیں۔ حضرت داؤد فرماتے ہیں کہ:۔

"میری ساری ہڈیاں کہیں گی اے خُداوند! تجھ سا کون ہے، جو غریب کو اُس کے ہاتھ سے جو اُس سے زور آور ہے اُور مسکین و محتاج کو غارت گر سے چھڑاتا ہے" (زبور ۳۵: ۱۰)

حضرت یُوسف کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

"اور یُوسف نے بنی اسرائیل سے قسم لے کر کہا، خُدا یقیناً تُم کو یاد کریگا۔ سو تُم ضرور ہی میری ہڈیوں کو یہاں سے لے جانا" (پیدائش ۵۰: ۲۵)

نیز ذیل کے حوالے ملاحظہ ہوں:۔

خروج ۱۳: ۱۹۔ یشوع ۲۴: ۳۲۔ ۱-سموئیل ۳۱: ۱۳۔ ۲-سموئیل ۲۱: ۱۲ و ۱۴، ۱-سلاطین ۱۳: ۳۱ و ۲-سلاطین ۱۳: ۱۶۔ وغیرہ

CamScanner

(۴) לֵבָב یعنی لُبّ و لُباب جس کو عربی میں لُبّ و لُباب کہتے ہیں، یعنی دِل۔ بائبل مُقدّس میں اکثر یہ نفس کے معنوں میں استعمال ہُوا ہے۔ ملاحظہ ہوں:۔

(۱) "ہائے میرا دِل! میرے پردۂ دِل میں درد ہے۔ میرا دِل بیتاب ہے۔ مَیں چُپ نہیں رہ سکتا، کیونکہ اُے میری جان تُو نے نرسنگے کی آواز اور لڑائی کی للکار سُن لی ہے۔" (یرمیاہ ۴: ۱۹)۔

اس آیت میں لفظ جان نفس کا ترجمہ ہے، اور نفس دِل کے معنوں میں استعمال ہُوا ہے۔

(۲) میرا دِل اور میرا جسم زندہ خُدا کے لئے خُوشی سے للکارتے ہیں۔"
(زبُور ۸۴: ۲)

یہاں دِل سے مراد نفس ہے۔

(۳) تب اسرائیل کے خُدا نے اسُور کے بادشاہ پول کے دِل (رُوح) کو اور اسُور کے بادشاہ تلگات پلنا صر کے دِل (رُوح) کو اُبھارا۔"
(۱۔ تواریخ ۵: ۲۶)

یہاں جس لفظ کا ترجمہ "دِل" ہُوا ہے، وُہ اصل عبرانی میں "رُوح" ہے، جو صحیح ترجمہ ہے۔ یہاں ہم انہیں حوالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ جہاں ہم دِل پر بحث کریں گے، وہاں تفصیل کے ساتھ لفظِ دِل کی تشریح کریں گے۔ جس طرح بائبل مقدّس نے انسان کے مادی حِصّہ کو تقسیم کیا ہے، اسی طرح اس کے غیر مادی حِصّہ کو بھی جان یعنی زندگی یا نفس

اَور رُوح میں تقسیم کیا ہے۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان دونوں کا فرق بتلائیں، کیونکہ بہت سے ایسے لوگ ہیں، جو زندگی اَور رُوح میں فرق نہیں کرتے ہیں۔ مثلاً سینیچر مشن والے۔

جان یعنی زندگی کیا ہے؟

۵ زِندگی کیا ہے عناصر میں ظہُورِ ترتیب
مَوت کیا ہے انہی اجزا کا پریشان ہونا

اس کائنات میں تین چیزیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی (۱) جمادات۔ (۲) نباتات۔ (۳) حیوانات۔ جن کو موالیدِ ثلاثہ کہتے ہیں۔ ان میں سے جمادات تو بے جان ہیں اَور نباتات اَور حیوانات جاندار ہیں۔

عرب کے ماہرین علم الحیات (Biologists) جان یعنی نفس کی یہ تعریف کرتے ہیں، کہ کمالٌ اوّلٌ لجسمٍ طبعیٍ آلیٍ یعنی نفس جسم طبعی کا جو صاحب آلہ (Organ) ہے کمالِ اوّل ہے جس کی تشریح وُہ یُوں کرتے ہیں، کہ جسم طبعی میں عناصر کی ترکیب و امتزاج اَور کسر و انکسار کے بعد ایک ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وُہ زندگی حاصل کرنے کے قابل بن جاتا ہے۔ جب جسم میں یہ قابلیت پیدا ہو جاتی ہے تو اُس وقت خُدا جو مبدءِ جُود[1] و الفیض ہے اس جسم

[1] جُود کے لفظی معنی بخشش کرنے کے ہیں لیکن فلسفہ کی اصطلاح میں جُود کے یہ معنی ہیں کہ جس چیز میں جس چیز کے تنزل کرنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے، خُدا ضرور اس چیز کا فیضان کرتا ہے بشرطیکہ وُہ چیز اُس کے لئے باعثِ نفع ہو نہ کہ باعثِ نقصان۔ (مترجم)۔

ہیں زندگی کا فیضان کرتا ہے۔ پس یہ زندگی نباتات و حیوانات میں مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً :-

نفس نباتی یا نباتی زندگی:- نباتات میں زندگی کے خاص آثار یہ ہیں۔ (۱) قوتِ تغذیہ (۲) قوتِ تنمیہ (۳) قوتِ بدل ما یتحلل (۴) قوتِ تولید۔

نفس حیوانی یا حیوانی زندگی:- (۱) قوتِ تغذیہ۔ (۲) قوتِ تنمیہ۔ (۳) قوتِ بدل ما یتحلل۔ (۴) قوتِ تولید۔ (۵) قوتِ حرکت بالارادہ۔

پس نباتی زندگی اور حیوانی زندگی میں صرف اتنا فرق ہے کہ نباتات میں حرکت ارادی نہیں ہوتی ہے اور حیوانات میں حرکت ارادی ہوتی ہے۔ چونکہ انسان بھی ایک قسم کا حیوان ہے، لہٰذا زندگی کے لحاظ[1] سے نباتات اور باقی حیوانات کے ساتھ برابر کا شریک اور سہیم ہے۔ چنانچہ بائبل مقدس بھی اس کی تصدیق کرتی ہے کہ :-

"میں نے دل میں کہا کہ یہ بنی آدم کے لئے ہے کہ خدا اُن کو جانچے اور وہ سمجھ لیں کہ ہم خود حیوان ہیں، کیونکہ جو کچھ بنی آدم پر گزرتا ہے، وہی حیوان پر گزرتا ہے۔ ایک ہی حادثہ دونوں پر گزرتا ہے۔ جس طرح وہ مرتا ہے اُسی طرح وہ مرتا ہے۔ ہاں سب میں ایک ہی سانس ہے اور انسان کو

---

[1] (نوٹ) اس کو آپ اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ زندگی کے لحاظ سے نباتات و حیوانات اور انسان میں کچھ فرق نہیں ہے۔ انسان اور باقی حیوانات میں جو فرق ہے وہ روح کے لحاظ سے ہے۔ جس پر ہم روح کی بحث میں تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے (منہ)

حیوان پر کچھ فوقیت نہیں کیونکہ سب بطلان ہے۔" (واعظ ۳ : ۱۸-۱۹)

سینچر مشن والے اس آیت سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ انسان اور حیوان میں ایک ہی رُوح[1] ہے۔ کیونکہ جس لفظ کا ترجمہ "سانس" کیا گیا ہے وہ اصل عبرانی میں "رُوح" ہے۔ جس طرح کہ حیوانات کی موت کے ساتھ اُن کی ارواح بھی مرکر فنا ہو جاتی ہیں۔ اس غلط اور غلط استدلال کی وجہ یہ ہے کہ ان بے چاروں کو لفظ "رُوح" کے حقیقی اور مجازی استعمالات کا علم نہیں ہے، جس کی حقیقت آگے چل کر ہم واضح کر دیں گے۔

زمانہ حاضرہ کے ماہرین علم الحیات، عرب کے ماہرین علم الحیات کے ساتھ حیات کے آثار کے متعلق بالکل متفق اللسان ہیں، صرف نفس حیات کے متعلق عربوں سے اختلاف کرتے ہیں۔ عربوں کے ماہرین علم الحیات کے نزدیک مادہ ایک بے جان چیز ہے۔ بے جان چیز سے جان یعنی زندگی کسی صورت میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا خُدا جو زندگی کا سرچشمہ ہے، زندگی کا خالق ہے۔ یعنی خُدا ہی مادہ میں زندگی پیدا کرتا ہے جو بائبل مُقدّس کی تعلیم کے عین موافق ہے۔ مغربی ماہرین علم الحیات جن میں اکثر مادہ پرست ہیں، یہ کہتے ہیں کہ نباتی اور حیوانی زندگی پیدا کرنے میں خُدا کا (بشرطیکہ اگر کوئی خُدا ہو) کوئی تعلق نہیں ہے۔ زندگی زندہ خلیات (Living Cells) کا اور مادۃ الحیات (Protoplasm) کا کرشمہ ہے۔ اس نظریہ کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے خلیات اور مادۃ الحیات کی تشریح از بس ضروری

---

[1] بے شک ایک رُوح ہے لیکن رُوح حیوانی جس کی تشریح خُون کی بحث میں کی جائے گی۔ (منہ)

ہے۔ جس کو ہم ذیل میں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں :-

خلیّہ خلیہ Cell یعنی درحقیقت ایک نہایت ہی چھوٹا سا حیوانی ذرہ ہے جو مختلف جسامت کا ہوتا ہے - چنانچہ بعض خلیات تو نہایت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں، جو خورد بین کے بغیر دکھائی نہیں دیتے ہیں - اس قسم کے کچھ خلیات کو اگر ایک سُوئی کی نوک پر رکھ دیں تو نہایت آسانی کے ساتھ علیحدہ علیحدہ ٹھہر سکتے ہیں - لیکن بعض اتنے بڑے بڑے بھی ہوتے ہیں، جو خورد بین کے بغیر بھی دکھائی دیتے ہیں - یہ بالعموم $\frac{1}{1000}$ سے $\frac{1}{100}$ انچ کی جسامت کے ہوتے ہیں - یعنی بعض تو اس قدر چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں کہ اگر ان کو ایک قطار میں ساتھ ساتھ ملا کر رکھا جائے تو ایک انچ لمبی قطار میں چھ ہزار خلیات آجاتے ہیں - اور بعض اتنے بڑے بڑے بھی ہوتے ہیں کہ ایک انچ لمبی قطار میں صرف ایک سو ہی آتے ہیں -

خلیہ کی ساخت :- ہر ایک معمولی خلیہ ایک نہایت ہی چھوٹا سا ذرہ یا نہایت ہی چھوٹی سی تھیلی ہوتی ہے، جس کی ساخت میں باہر کی طرف ایک شفاف حُبابی جھلی ہوتی ہے اور اندر کی طرف ایک شفاف لیسدار رطوبت ہوتی ہے جس کو Protoplasm یعنی مادہ حیات یا مادالحیات کہتے ہیں - اس مادہ حیات کے درمیان ایک چھوٹا سا دانہ ہوتا ہے - جس کو Nucleus یعنی جوہر حیات کہتے ہیں - اور کبھی اس جوہر حیات

ہ Cell کے لغوی معنی اُس کوٹھری کے ہیں جس میں سامان یا اسباب رکھا جاتا ہے - پرانی انگریزی میں ایک اور لفظ Celle بھی ہے جس کے معنی اُس غار کے ہیں جس میں درویش یا زاہد رہا کرتے تھے - منہ

کے اندر ایک اور نُقطہ ہوتا ہے جس کو Nucleus کہتے ہیں۔ گویا کہ مادۂ حیات کا ہر ایک خلیہ ایک نہایت چھوٹا سا ذرہ ہوتا ہے جس کے مرکز میں جوہرِ حیات ہوتا ہے۔

مادہ حیات یعنی Protoplasm مادہ حیات انڈے کی سفیدی کی مانند ایک رقیق لُعاب دار شفاف رطُوبت ہوتی ہے جس میں افزائش اور زندہ اجسام کی نوعیت میں تبدیل ہونے کی قُدرتی طاقت ہوتی ہے۔ نیز اس میں زندگی کے ذاتی آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ مادۂ الحیات جسم کے اندر کسی ایک جگہ جمع نہیں ہوتا ہے، بلکہ یہ خلیات میں تقسیم ہوتا ہے جن کی ترکیب واجتماع سے جسم بنتا ہے۔ گویا کہ جسم کے ہر ایک ذرہ کا جُزِ اصلی یہی مادۂ الحیات ہوتا ہے۔ یعنی اس کے بغیر کسی جاندار ذرہ یا خلیہ کا وجُود نہیں ہوتا۔ مادۂ حیات میں زندگی کے تمام آثار پائے جاتے ہیں، یعنی اس میں (۱) حرکت کرنے کی قوّت ہوتی ہے۔ (۲) اس میں غذا حاصل کرنے کی قُوّت پائی جاتی ہے (۳) اس میں غذا کو جُزوِ بدن یعنی اپنی شکل میں تبدیل کرنے کی قُوّت ہوتی ہے جس کو بدل مایتحلل کہتے ہیں (۴) یہ آکسیجن کو جذب کرتا ہے، اور کاربانک ایسڈ گیس کو خارج کرتا ہے یعنی سانس لیتا ہے یہی چار باتیں زمانہ حاضرہ کے ماہرین علم الحیات کے نزدیک زندگی کے ذاتی آثار ہیں۔ شرح اشارات وباب الفتوح المعرفت احوال الروح وتشریح انسانی ومنافع الاشیاء

(A Short Course General Biology in B... ...y)

زندگی اَور چیز ہے اَور رُوح اَور چیز

زِندگی بیان ا فرق کے ساتھ ساتھ اگر آپ بائبل مُقدّس کے پہلے دو بابوں کی اُن آیات کو پڑھیں، جن میں حیوانات اَور انسان کی پیدائش کا بیان ہے، تو واضح ہو جاتا ہے کہ خُدائے برتر و حکیم نے آغازِ آفرینش میں یہ بتلانا تھا کہ "نفس" یعنی زندگی اَور چیز ہے، اَور "نسمہ" یعنی رُوح اَور چیز ہے۔ حیوانات کے متعلق صرف اتنا فرمایا کہ:- لِیَفِضِ الْمِیَاہُ ذَخَافَاتِ ذاتِ نَفْسٍ حَیَّۃٍ (پیدائش ۱:۲۰) یعنی "خُدا نے کہا کہ پانی جانداروں کو کثرت سے پیدا کرے۔" وَقَالَ اللہُ لِتُخْرِجِ الْاَرْضُ ذَوَاتِ اَنْفُسٍ حَیَّۃٍ کَجِنْسِھَا" یعنی اَور خُدا نے کہا کہ زمین جانداروں کو اُن کی جنس کے موافق پیدا کرے۔" (پیدائش ۱:۲۴) ان آیات کو غور سے پڑھئیے اَور دیکھئیے کہ حیوانات کے متعلق بجز "نفس حیا" کے فیضان کے اَور کسی چیز کا ذکر نہیں، جس سے صاف واضح ہوتا ہے، کہ حیوانات میں صرف ایک چیز کا فیضان ہُوا ہے یعنی جان یا زندگی کا اَور بس۔ لیکن انسان کے متعلق فرماتا ہے کہ "وَجَبَلَ الرَّبُّ اللہُ آدَمَ تُرَابًا مِنَ الْاَرْضِ وَنَفَخَ فِی اَنْفِہٖ نَسْمَۃَ حَیٰوۃٍ فَصَارَ آدَمُ نَفْسًا حَیَّۃً (پیدائش ۲:۷) یعنی "اَور خُدا نے زمین کی مٹی سے انسان کو بنایا اَور اُس کے نتھنوں میں زندگی کا نسمہ پھونکا تو انسان جیتی جان بنا۔" ان آیات پر میں قسط اوّل میں بائبل مُقدّس کی رُو سے کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کر چکا ہُوں

یہاں صرف یہ بتلانا منظور ہے کہ :-

حیوان اور انسان میں حدِ مشترک

بائبل مقدس نے حیوانات اور انسان کی غیر مادی آفرینش کے متعلق دو باتیں بتلائی ہیں ایک حدِ مشترک۔ دوم حدِ فاصل۔ حدِ مشترک "نفس حیا" ہے یعنی حیوان اور انسان نفس (زندگی) کے لحاظ سے بالکل ایک دوسرے کے سہیم اور شریک ہیں۔ ان میں اس اعتبار سے سرِ مو فرق نہیں۔ جس طرح (۱) حیوان کھاتا ہے، اسیطرح انسان کھاتا ہے۔ (۲) جس طرح حیوان نامی (صاحب بالیدگی) ہے، اسی طرح انسان نامی ہے۔ (۳) جس طرح حیوان میں قوت تولید ہے اسی طرح انسان میں قوت تولید ہے۔ (۴) جس طرح حیوان متحرک بالارادہ ہے، اسی طرح انسان بھی متحرک بالارادہ ہے۔ (۵) جس طرح حیوان سانس لیتا ہے اسی طرح انسان سانس لیتا ہے، وغیرہ۔ یہی امور ہیں جن کو ماہرین علم الحیات نے زندگی کے آثارِ اولیہ بتلایا ہے، جو جسم کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں اور جسم کے ساتھ ختم ہوتے ہیں۔

حیوان اور انسان میں حدِ فاصل

پس اگر انسانی اور حیوانی زندگی میں کوئی مابہ الامتیاز یا حدِ فاصل نہیں ہے تو ایسی زندگی پر خاک۔ اگر انسان میں صرف یہی زندگی ہے جو چند عناصر کے کسر و انکسار اور ایک معتدل ترکیب و ترتیب سے پیدا ہوتی ہے، اور ان عناصر کے انتشار و اختلال کے بعد جسم کے ساتھ

ختم ہوجاتی ہے، تو انسان کے لئے اس کی مطلق ضرورت نہیں کہ وہ نیکی اور بدی کے مسائل اور ان کی تشریح و تفصیل میں سرگرداں اور پریشان رہے۔ بلکہ "کھاؤ۔ پیو اور عیش کرو۔ کیونکہ تمہاری زندگی چند روزہ اور ناپائیدار ہے جو جسم کے ساتھ پیدا ہوئی ہے اور جسم کے ساتھ مٹ جائیگی" کی غلط تعلیم پر عمل کرنا اس کے لئے بہتر و مناسب ہے۔ اگر فی الحقیقت انسان میں یہی زندگی ہے جو باقی حیوانات میں ہے تو نیکی کو نیکی سمجھنا اور بدی کو بدی سمجھنا اور خدا کے نام پر طرح طرح کے آلام و مصائب برداشت کرنا ایک ایک احمقانہ فعل ہوگا۔ بلکہ وہ لوگ فائدے میں رہیں گے جو دنیاوی عیش و عشرت میں گلچھرے اڑاتے ہیں اور اپنی خواہشات نفسانی کو پورا کرتے رہتے ہیں کیونکہ موجودہ زندگی کی دوڑ موجودہ جسم سے شروع ہوکر موجودہ جسم کے خاتمہ کے ساتھ ختم ہوجائے گی۔

لیکن بائبل مقدس نے ہمیں اس غلط اور خطرناک نظریہ سے، کہ "انسانی و حیوانی زندگی میں کوئی فرق نہیں ہے" محفوظ رکھنے کی غرض سے یہ بتلایا کہ انسان میں صرف "نفس حیا" نہیں ہے، بلکہ اس میں ایک لاہوتی زندگی بھی ہے اور وہ "نسمہ" ہے جو صاحب تعقل و ادراک ہے جو جسم کے ساتھ بطور مدبر و متصرف کے تعلق رکھتا ہے۔ جو جسم کے مٹنے کے ساتھ نہیں مٹتا ہے بلکہ خدا کے حکم کے ماتحت ابد تک زندہ رہتا ہے۔ اسی نسمہ کی وجہ سے انسان اپنے تمام اعمال حسنہ و افعال قبیحہ کا ذمہ دار ہے اور باقی حیوانات اس ذمہ داری سے بری ہیں۔ پروفیسر ڈرائیو

مرحوم اپنی تفسیر پیدائش میں اس آیت کی تفسیر میں کہ " وَ نَفَخَ فِی اَنْفِهٖ نَسْمَۃَ حَیٰوۃٍ " (پیدائش ۲:۷) لکھتے ہیں کہ:

Man's pre-eminence is implied in the use of the special term breathed (   ) which is not used of the other animals, and which suggests that in this case the breath of life stands in a special relation to the creator and may be the vehicle of higher faculties than those possessed by animals generally.

But it means more than this, it means that the breath breathed in by creator who was immortal conferred thereby on man the faculty of becoming immortal.

یعنی " انسان کی فوقیت دوسرے حیوانات پر لفظ " پھونکا " سے ظاہر ہوتی ہے کیونکہ یہ ایک خاص لفظ ہے جس کا صرف انسان پر اطلاق ہوا ہے اور باقی حیوانات پر اس کا اطلاق نہیں ہوا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کے معاملہ میں " زندگی کا دم " (نسمہ) اپنے خالق کے ساتھ انسان کا ایک خاص تعلق ظاہر کرتا ہے کہ بہ نسبت دیگر حیوانات کے یہ اعلیٰ اوصاف و قابلیت کا حامل ہو سکتا ہے "

مصنف کہتا ہے کہ نہ صرف اس کا یہ مطلب ہے جو ڈاکٹر صاحب نے سمجھا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ خدا نے جو خود غیر فانی ہے انسان میں دم پھونکنے کی وجہ سے اس کو غیر فانی بنا دیا ہے۔ (p 198)

پس جہاں حیوان اور انسان میں حد مشترک " نفس حیا " ہے،

وہاں انسان اور حیوان کے درمیان حدِّ فاصل "نسمہ" ہے یعنی دیگر حیوانات میں صرف نفس (زندگی) اور انسان میں نفس اور نسمہ دونوں ہیں۔ منطقی علماء حیوان کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ "جسمٌ نامیٌ حساسٌ متحرکٌ بالارادہ۔ اس تعریف میں انسان بھی شامل ہے۔ مثلاً اگر کوئی یہ سوال کرے کہ "انسان، گھوڑا، بیل، خچر کیا ہیں؟ تو جواب دیا جائے گا کہ حیوان پس حیوانیت میں انسان بھی شامل ہے۔ لیکن اس شمول کے باوجود انسان میں ایک خاص بات ایسی پائی جاتی ہے جو باقی حیوانات میں نہیں ہے۔ وہ بات جو باقی حیوانات میں نہیں پائی جاتی، فلسفہ کی اصطلاح میں ادراک یا تعقّل ہے' اور منطق کی اصطلاح میں نُطق ہے۔ اس لئے منطقیوں نے نُطق کو حیوان اور انسان میں فصل یعنی حدِ فاصل مانا ہے۔ لہٰذا وہ انسان کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ "انسان حیوانِ ناطق" ہے اور ناطق کے معنی "دریابندۂ معقولات" کرتے ہیں۔ اسی دریابندۂ معقولات کو بائبل مقدس کی اصطلاح میں "نسمہ" یا "روح" کہا گیا ہے، جس پر آگے چل کر ہم سیر حاصل بحث کریں گے۔

ایک لطیف نکتہ

پیدائش کی کتاب میں انسان کے متعلق لکھا ہے کہ "خدا نے انسان (آدم) کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔" (پیدائش ۱: ۲۶ و ۲۷) اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت میں انسان سے کیا مراد ہے؟ آیا یہی گوشت پوست یعنی جسد جس کو ہم دیکھتے ہیں چھوتے ہیں۔ جو آج پیدا ہوتا ہے اور کل مر کر خاک ہو جاتا ہے جو فانی ہے بے ثبات

؎ حیوان بڑھنے والا جسم رکھتا ہے اور ارادہ کے ساتھ حرکت کرتا ہے (منہ)

ہے اور ناپائیدار ہے یا اس سے علیحدہ کوئی اور چیز مُراد ہے ؟ اگر کوئی یہ کہے کہ اس (آدم) سے مُراد گوشت پوست یعنی جسد ہے جو لواحق و عوارضِ بالا کا مورد ہے، تو میں یہ کہوں گا۔ کہ پھر انسان کو باقی حیوانات پر کیا فوقیت و فضیلت حاصل تھی، کیونکہ جسم اور جسمانی اوصاف کے اعتبار سے باقی حیوانات کو انسان پر بدرجہا فوقیت حاصل ہے۔ کیا انسان خوبصورتی میں پھولوں اور دیگر نباتات کا مقابلہ کر سکتا ہے ؟ کیا زور و طاقت میں شیر اور ہاتھی وغیرہم کا مقابلہ کر سکتا ہے ؟ کیا جست و خیز و سرعتِ رفتار میں ہرن و گھوڑے وغیرہ کا مقابلہ کر سکتا ہے ؟ کیا تیزیٔ نظر اور درازیٔ عمر میں نسر (گدھ) و عقاب کا مقابلہ کر سکتا ہے ؟ ہرگز نہیں۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ خدا نے باقی حیوانات کو چھوڑ کر صرف حضرت انسان کو "اپنی صورت پر" انتخاب کیا ؟

اگر کوئی یہ کہے کہ انسان کو دماغ کی ساخت کے لحاظ سے باقی حیوانات پر فوقیت ہے تو میں یہ کہوں گا کہ اس کا ثبوت کیا ہے، بہت سے ایسے حیوان بھی ہیں جن کے دماغ میں اور انسان کے دماغ میں قابلِ اعتنا فرق نہیں ہے۔ مثلاً چمپانزی (Chimpanzee) کے دماغ میں اور انسان کے دماغ میں کوئی قابلِ اعتنا فرق نہیں ہے[1]۔

انسانِ حسّی اور انسانِ عقلی

لہٰذا ظاہر ہے کہ جس انسان کو "خدا نے اپنی صورت پر بنایا" وہ یہ انسان نہیں ہے، جس کو حکماء "انسانِ حسّی" اور مقدس پولس "انسانِ ظاہری"

---

[1] دماغ پر ہم دماغ کے مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

(۲-کرنتھیوں ۴: ۱۶) کہتے ہیں، کیونکہ اس "انسانِ حسّی" میں کوئی ایسی خاص بات نہیں پائی جاتی جو باقی حیوانات پر باعثِ ترجیح بن سکے، اور "انسانِ ظاہری" اور دیگر حیوانات میں کسی لحاظ سے بھی سرِ مُو فرق نہیں ہے۔ پس جس انسان کو خدا نے "اپنی صورت پر بنایا"، وہ حکماء کی اصطلاح میں "انسانِ عقلی" یعنی رُوح ہے اور مقدّس پولس کی اصطلاح میں "انسانِ باطنی" ہے چنانچہ مُقدّس پولس لکھتے ہیں کہ:-

"گو ہماری ظاہری انسانیت زائل ہوتی جاتی ہے، پھر بھی ہماری باطنی انسانیت روز بروز نئی ہوتی جاتی ہے" (۲-کرنتھیوں ۴: ۱۶)، اس بات کے سمجھنے کے لئے کہ آیتِ مافوق میں "ظاہری انسانیت" اور "باطنی انسانیت" سے کیا مُراد ہے؟ یونانی فلاسفروں کے سرتاج مُعلّمِ اوّل کے قول سے بالوضاحت سمجھ میں آجائے گی چنانچہ لکھتے ہیں کہ:-

ان الانسان الحسّی انما ھو صنم للانسان العقلی والانسان العقلی روحانی وجمیع اعصابہ روحانیۃ یعنی "انسانِ ظاہری (حسّی) انسانِ باطنی (عقلی) کا صرف ایک بُت یعنی ڈھانچہ ہے اور انسانِ عقلی سراپا رُوحانی ہے اور اس کے تمام اعضاء رُوحانی ہیں" (کتاب باب الفتوح لمعرفۃ احوال الرُوح)

انسانِ ظاہری اور انسانِ باطنی میں فرق

مصنف "کتاب باب الفتوح" انسانِ ظاہری اور انسانِ باطنی میں فرق بتلاتے

ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

الانسان یطلق علی معنیین احدھما محسوس مشاھد یراہ البصر و یحسّہ اللمس والثانی النفس الناطقۃ التی ھی اللطیفۃ المذکورۃ والانسان الاول لہ لوازم وخصائص تمیز بھا عن الثانی وکذا الثانی بل اکثر اوصافہ یباین الاول فان الاول میت بطبعہ والثانی حی بالذات والاول مدرک بالحواس والثانی لا یدرک الا بالعقل والانسان عند التحقیق ھو الثانی وتسمیۃ الاول بانسان مجاز کما یسمی ضوء الشمس شمساً فکما ان ضوءھا قائم بھا تابع لھا یستدل بہ علیھا فکذا الانسان الظاھر ظل وشبح للانسان الحقیقی ؎

یعنی " انسان کا اطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے۔ ایک اُس انسان پر جو محسوس ہے اور مشاہدہ میں آتا ہے اور جس کو آنکھ دیکھتی ہے اور ہاتھ چھو لیتا ہے۔ دوسرا اُس انسان پر جس کو نفس ناطقہ (رُوح) کہتے ہیں۔ انسانِ محسوس کے بہت سے لوازم اور خصائص ہیں، جو اس میں اور انسانِ عقلی (رُوح) میں فرق پیدا کر دیتے ہیں۔ اسی طرح انسانِ عقلی (رُوح) میں بہت سے ایسے اوصاف ہیں جو انسانِ محسوس کے اوصاف کے بالکل برخلاف ہیں مثلاً انسانِ محسوس طبعی طور پر قابلِ موت ہے۔ لیکن انسانِ عقلی ذاتی طور پر زندہ ہے۔ انسانِ محسوس حواس کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے اور انسانِ عقلی بجز عقل کے مدرک نہیں ہوتا۔

حقیقت میں جس کو انسان کہنا چاہیئے وہ یہی نفسِ ناطقہ یعنی رُوح ہے۔ انسانِ محسوس کو انسان کہنا صرف مجاز ہے، جس طرح کہ آفتاب کی روشنی کو آفتاب کہنا پس جس طرح کہ روشنی آفتاب پر قائم ہے، اور اس کے تابع ہے اور روشنی سے آفتاب پر دلیل پیش کرتے ہیں، اسی طرح انسانِ ظاہری انسانِ باطنی کا سایہ اور شبیہ ہے۔" پس صاف ظاہر ہے کہ انسان کی برتری و افضلیت دیگر حیوانات پر صرف انسانِ عقلی کی وجہ سے ہے جس کو رُوح کہتے ہیں اور اسی رُوح کو خدا نے "اپنی صورت پر" بنایا۔ پس بطریقِ احسن ثابت ہے کہ زندگی اور چیز ہے اور رُوح اور چیز۔ زندگی نباتات و حیوانات اور انسان تینوں میں مشترک ہے، لیکن رُوح صرف انسان کے ساتھ مختص ہے۔"

زندگی کے ارکان

رُکنِ اوّل
خُون یا رُوح

زندگی کی بقا اور قیام دو چیزوں پر موقوف ہے یعنی خُون اور نفس پر خون جس کو اطبا رُوح اور قوتِ حیات کہتے ہیں، اس کا بیان وہ یوں کرتے ہیں کہ جب خُون جگر سے دل کے بائیں بطن Left Ventricle میں آتا ہے تو اُس خُون سے جو بخارات پیدا ہوتے ہیں، ان (بخارات) کے جوہرِ لطیف کو رُوح کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک رُوح کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) رُوح حیوانی - (۲) رُوح طبعی - (۳) رُوح نفسانی۔

رُوح حیوانی دِل میں پیدا ہوتی ہے اور اس کا جو حصّہ دِل سے جگر کی طرف جاتا ہے اُس کو رُوح طبعی کہتے ہیں اور جو حصّہ دِل سے دماغ کی طرف چلا جاتا ہے اس کو رُوح نفسانی کہتے ہیں۔

رُوحِ حیوانی | یہ دِل میں پیدا ہوتی ہے اور دِل سے بذریعہ شرائین (Arteries) خُون کے ساتھ تمام جسم میں جاتی ہے۔ یہ قُوّتِ حیوانی کی حامل ہے جس سے زندگی قائم رہتی ہے اور اسی کے ساتھ نفسِ ناطقہ کا تعلّق ہوتا ہے۔ جب یہ رُوح ختم ہو جاتی ہے، تو نفسِ ناطقہ جسم سے قطع تعلّق کرتی ہے۔ اس رُوح حیوانی کو انگریزی میں (Vital Spirit) اور (Pneuma Zotikon) کہتے ہیں۔

رُوحِ طبعی | رُوح حیوانی کا وُہ حصّہ جو دِل سے جگر میں چلا جاتا ہے، اس کو رُوح طبعی سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ قُوّتِ طبعی کی حامل ہے، جس کے ذریعہ بدن کی پرورش اور اس کی نشوونما ہوتی ہے۔ انگریزی میں اس کو (Pneuma Physikon) اور Natural Spirit کہتے ہیں۔

رُوحِ نفسانی | رُوح حیوانی کا وُہ حصّہ جو دِل سے دماغ میں چلا جاتا ہے، رُوح نفسانی کہلاتا ہے۔ یہ رُوح قُوّتِ نفسانی یعنی قُوّتِ

لہ تحقیقات جدیدہ کی رُو سے رُوح حیوانی درحقیقت وُہ نسیم Oxygen ہے، جو کہ شریانی خُون میں ہوتی ہے اور اسی کے ذریعہ تمام جسم میں جاتی ہے اور جسم کو زندگی پہنچاتی ہے۔ پس متقدمین اطباء کا یہ قول کہ شریانی خُون رُوحِ حیوانی کا حامل ہے اور وُہ اس کو تمام اعضا تک پہنچاتا ہے نہایت صحیح ہے۔ (منہ)

حس و حرکت کی حامل ہے اور دماغ سے بذریعہ اعصاب تمام جسم میں پھیل کر اعضاء کو قوتِ حس و حرکت عطا کرتی ہے انگریزی میں اس کو Animal Spirit کہتے ہیں۔ (منافع الاعضاء)

خون کے فوائد

خون کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ تمام اعضائے بدن کو غذا اور روح پہنچاتا ہے اور ان کے فضلات کو اخراج کے لئے واپس لے جاتا ہے۔ تمام اعضائے جسم خون ہی سے زندہ ہیں، کیونکہ اسی سے وہ تمام ضروری مواد حاصل کرتے ہیں، اور اسی میں وہ تمام فضلات جن کی انہیں آئندہ ضرورت نہیں ہوتی خارج کرتے ہیں۔ پس خون بدن کے ہر ایک حصے کی غذا کے لئے مناسب مواد مہیا کرتا ہے۔ اور (۲) بعض جسم کے غدود دل تک وہ ان مواد مطلوبہ کو پہنچاتا ہے جن میں ان کی قوتِ مغیرہ سے خاص رطوبات پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً خون پستان میں ایسے اجزاء لے جاتا ہے جو دودھ بننے کے لائق ہیں۔ (۳) خون ہی روحِ حیوانی کا حامل ہے۔ اور وہ اس کو تمام اعضائے بدن تک پہنچاتا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر بدن کا کوئی حصہ اپنا فعل جاری نہیں رکھ سکتا ہے۔ (۴) خون بدن کے ہر ایک حصے کے فضلات کو لے کر ان اعضا تک پہنچا دیتا ہے، جو انہیں لے کر خارج کر دیتے ہیں۔ (۵) خون بدن کے ہر ایک حصے کو گرم اور تر رکھتا ہے یعنی جسم میں دورۂ خون سے حرارتِ بدن برقرار و قائم رہتی ہے بلکہ زندگی کا مدار بھی اسی پر ہے (منافع الاعضاء) A Short Course in Biology

کیا انسان اور حیوان میں ایک ہی روح ہے؟

خون کے مسئلہ پر میں نے قدرے تفصیل کے ساتھ اس لئے بحث کی تاکہ بائبل مقدس

کی ان آیات کے مفہوم کے سمجھنے میں دقت نہ ہو، جن کو سنیچری حضرات از راہِ فریب دہی یا فریب خوردگی یہ کہہ کر پیش کرتے ہیں کہ انسانوں اور حیوانوں میں ایک ہی رُوح[1] ہے۔ جس طرح حیوانوں کے مرنے کے ساتھ اُن کی رُوح بھی مر کر فنا ہوتی جاتی ہے، اسی طرح انسانوں کے مرنے کے ساتھ اُن کی رُوح بھی مر کر فنا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وُہ اپنے دعوے کی صداقت کے لئے بطور دلیل عہد عتیق کی ذیل کی آیتیں پیش کرتے ہیں[2]:-

(۱) کیونکہ جو بنی آدم پر گزرتا ہے سو حیوان پر گذرتا ہے۔ ایک ہی حادثہ دونوں پر گذرتا ہے۔ جس طرح یہ مرتا ہے، اُسی طرح وُہ بھی مرتا ہے۔ ہاں سب میں ایک ہی سانس ہے، اور انسان کو حیوان پر فوقیت نہیں، کیونکہ سب بُطلان ہے۔ (واعظ ۳ : ۱۹)

(۲) اگر وُہ اِنسان سے اپنا دِل لگائے۔ اگر وُہ اپنی رُوح اور اپنے کو واپس لے لے، تو تمام بشر اکٹھے فنا ہو جائیں گے اور انسان پھر مٹی میں مل جائے گا۔ (ایوب ۳۴ : ۱۴-۱۵)

(۳) اور سبھوں میں سے جن میں زندگی کا دم ہے، جوڑے جوڑے نوح کے پاس کشتی میں آئے۔ (پیدائش ۷ : ۱۵)

(۴) اور سب جانور جو زمین پر چلتے تھے۔ پرندے اور چوپائے اور جنگلی جانور اور زمین پر کے سب رینگنے والے جاندار اور سب آدمی[3]

---

[1] سنیچری اصطلاح میں "زندگی کا دم یا سانس" ہے۔ (مترجم)

[2] دیکھو ان کی کتاب "بائبل کی تعلیم" [3] آدمیوں کے مرنے سے کس کا فرقہ انکار ہے؟

مرگئے۔ (پیدائش ۷ : ۲۱)

(۵) اور خشکی کے سب جاندار جن کے نتھنوں میں زندگی کا دم تھا مرگئے۔

(پیدائش ۷ : ۲۲)

حوالہ نمبر(۱) و نمبر(۲) میں "سانس اور زندگی کا دم" لفظ "رُوح" کا ترجمہ ہے۔ عربی بائبل میں حوالہ نمبر(۱) میں "رُوح" کا ترجمہ نسمہ کیا ہے۔ اور حوالہ نمبر(۳) میں "رُوحِ حیات" کیا گیا ہے، جو نہایت صحیح اور موزوں ترجمہ ہے۔ سنیچری فرقہ نے جب یہ دیکھا کہ حوالہ نمبر(۱) میں انسان اور حیوان دونوں کے لئے "رُوح" کا لفظ استعمال ہوا ہے اور حوالہ نمبر(۳) میں حیوانات کے لئے بھی اسی طرح استعمال ہوا ہے جس طرح کہ انسان کے لئے استعمال ہوتا ہے، تو فرطِ مسرت کے ساتھ اعلان کرنے لگے کہ بس ہم نے ثابت کر دیا کہ انسان اور حیوان میں ایک ہی رُوح ہے اور جس طرح کہ حیوانات کے جسم کے ساتھ اُن کی رُوح[1] فنا ہو جاتی ہے انسان کے جسم کے ساتھ اُن کی رُوح بھی فنا ہو جاتی ہے۔ حالانکہ ان کا یہ دعوے ان کی علمی بے بضاعتی اور بد ذوقی کی دلیل ہے۔ کیونکہ :-

اوّل۔ آیت نمبر(۱) میں جس "رُوح" کا ذکر ہے وہ "رُوح حیوانی" ہے، جس کی توضیح ہم سطور مافوق میں کر چکے ہیں۔ چونکہ "رُوحِ حیوانی" انسان اور حیوان دونوں میں ساری و جاری ہے اور دونوں میں مشترک ہے، لہٰذا

---

[1] ہماری اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد سے اب وہ اس عقیدہ کو ترک کر چکے ہیں، اور اب نباتات اور حیوانات میں رُوح تسلیم نہیں کرتے ہیں، صرف انسان میں رُوح تسلیم کرتے ہیں۔ اس کتاب کے صفحہ ۶ کا حاشیہ نمبر ۲ ملاحظہ کیجئے۔

بائبل مقدس کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ "سب میں ایک ہی (رُوح) سانس" ہے اور یہی وجہ ہے کہ عربی بائبل میں برخلاف معمول اس کا ترجمہ "نسمہ" کیا ہے "نسمہ" کے معنی یہاں "نسیم" کے ہیں، جس کی معنوی تشریح ہم صہ میں کر چکے ہیں۔ اصطلاح تشریح صہ ۳۴ کے حاشیہ میں کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر غلام جیلانی صاحب بھی ہمیشہ (Oxygen) کا ترجمہ "نسیم" کیا کرتے ہیں (منافع الاعضا) کیونکہ نسیم ہی زندگی کی حامل ہے۔

دوم۔ یہ کہ اسی آیتِ زیر بحث کی اُوپر والی آیت میں صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آیت زیر بحث میں انسان کی حیوانیت ثابت کرنا مطلوب ہے نہ کہ اس کا حیوانِ ناطق ہونا۔ چنانچہ وہ آیت یہ ہے:۔

"میں نے دل میں کہا کہ یہ بنی آدم کے لئے ہے کہ خدا اُن کو جانچے اور وہ سمجھ لیں کہ ہم خود حیوان ہیں۔ (واعظ ۳: ۱۸)

چونکہ انسان کی حیوانیت ثابت کرنا مطلوب تھا، اس لئے ۱۹ آیت میں ان باتوں کا ذکر کیا جو انسان اور حیوان دونو میں مشترک ہیں۔ مثلاً دونوں کا مرنا، دونوں میں رُوحِ حیوانی کا ہونا، دونوں کا خاک ہو کر خاک میں مل جانا وغیرہ .....۔

سوم۔ خود اسی آیتِ زیر بحث کی اگلی آیت میں اس کی صراحت کی گئی ہے کہ انسانی رُوح جُداگانہ چیز ہے اور حیوانی رُوح علیحدہ چیز ہے۔ وہ آیتِ شریفہ یہ ہے۔

"کون جانتا ہے کہ انسان کی رُوح اُوپر کو چڑھتی ہے اور حیوان کی رُوح

زمین کی طرف نیچے کو جاتی ہے۔" (واعظ ۳: ۲۱)

باقی رہا انسان کی رُوح کا اُوپر چڑھنا اور حیوان کی رُوح کا نیچے کو جانا یہ ایک جُداگانہ مسئلہ ہے، جس کا تعلق مضمون زیرِ تحریر کے ساتھ نہیں۔ اس کا تعلق "رُوح کا بدن سے علیحدہ ہونے" کے ساتھ ہے، جس پر ہم آئندہ بحث کریں گے۔

چہارم۔ اگر کوئی بدمذاق شخص اب بھی ضد کرے کہ نہیں حیوان اور انسان دونوں میں ایک ہی رُوح ہے تو اس کا ثابت کرنا اُس کے ذمہ ہوگا کہ حیوانات میں بھی انسانوں کی طرح تعقّل (Reason) ہے جو قیامت تک نہ کر سکے گا۔

پنجم۔ بائبل مُقدّس نے حیوانی زندگی کی خاص تجدید فرمائی ہے کہ حیوانی زندگی کی کُل کائنات خُون ہے اور بس، چنانچہ لکھا ہے:۔

"اور بنی اسرائیل میں سے یا اُن پردیسیوں میں سے جو اُن میں بُود و باش کرتے ہیں جو کوئی شکار میں ایسے جانور یا پرندے کو پکڑے جس کا کھانا ٹھیک ہے تو وہ اُس کے خُون کو نکال کر اُسے مٹی سے ڈھانک دے کیونکہ جسم کی جان جو ہے وہ اُس کا خون ہے جو اُس کی جان کے ساتھ ایک ہے۔ اسی لئے مَیں نے بنی اسرائیل کو حکم کیا ہے کہ تم کسی قسم کے جانور کا خُون نہ کھانا، کیونکہ جانور کی جان اُس کا خُون ہی ہے۔

(احبار ۱۷: ۱۳-۱۴)

پس روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے کہ حیوانات کی رُوح سے رُوحِ

حیوانی مراد ہے، کیونکہ رُوحِ حیوانی ہی دِل میں پیدا ہوتی اور خُون کے ساتھ تمام بدن میں پہنچ کر رگ رگ میں زندگی پہنچاتی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر غلام جیلانی صاحب اپنی مشہور و معروف کتاب میں رُوحِ حیوانی کے متعلق لکھتے ہیں کہ :-

"مذکورہ بالا بیان سے صاف ظاہر ہے کہ خُون کے سُرخ دانے آکسیجن یا نسیم بردار ہیں اور اسی آکسیجن یا نسیم کو جبکہ وُہ خُون کے اندر پہنچ جاتی ہے، متقدمین اطبائے یُونان رُوحِ حیوانی کے نام سے پکارتے ہیں۔ پس ان کا یہ قول کہ شریانی خُون رُوحِ حیوانی کا حامل ہے اور وُہ اس کو تمام اعضائے بدن تک پہنچاتا ہے، بالکل صحیح اور نہایت قابلِ قدر ہے، کیونکہ زمانۂ حال کی علمی تحقیقات بھی اس کی مُصدّق و مؤیّد ہیں"

(منافع الاعضا۔ صفحہ ۹۴)

ڈاکٹر صاحب جس امر کو متقدمین اطبائے یُونان "کی طرف منسُوب کرتے ہیں وُہ درحقیقت بائبل مُقدّس کے فیضان کا نتیجہ ہے جبکہ سطحِ زمین پر یُونان اور اُس کے اطبا کا نام و نشان بھی موجُود نہ تھا، اُس وقت بائبل مُقدّس نے یہ تعلیم دی کہ "جانور کی جان اُس کا خُون ہی ہے"۔

(حوالہ نمبر ۳) اسی طرح حوالہ نمبر ۳ میں بھی رُوح سے مراد رُوحِ حیوانی ہے۔ اسی لئے عربی بائبل میں اس کا ترجمہ رُوحِ حیات کیا گیا ہے جو رُوحِ حیوانی کا ٹھیک ہم معنی لفظ ہے۔ یعنی "زندگی کی رُوح" حوالہ نمبر (۴) میں نیچری فرقہ کی کوئی مطلب کی بات نہیں ہے۔ اس میں لفظ "سائنس"

لہ خُون کے سُرخ دانوں کی بحث کی طرف اشارہ ہے۔ (منہ)

یا "رُوح" نہیں آیا ہے، جس پر ہم بحث کریں۔ معلوم نہیں اس آیت کے حوالہ سے اُن کا مطلب کیا ہے؟

حوالہ نمبر ۲ پر ص۳ میں ہم مُفصّل بحث کر چکے ہیں۔ یہ آیت ہماری تائید میں ہے اور اُن کی تردید میں۔ حوالہ نمبر ۵ نہایت دلچسپ آیت ہے۔ چونکہ اس کا تعلق اس بحث کے ساتھ نہیں ہے، اس لئے اس مبحث میں ہم اس پر بحث نہیں کر سکتے ہیں۔ اس کا تعلق عملِ تنفس کے ساتھ ہے۔ لہٰذا بحثِ تنفس پر ہم اس پر بحث کریں گے۔ المختصر اب میں ذیل میں چند باتیں بطور اصُول موضوعہ لکھتا ہُوں، جن کو ذہن نشین کرنے سے پھر کبھی آپ کو یہ فرقہ ضالّہ فریب نہیں دے سکے گا کہ "انسان و حیوان دونوں میں ایک ہی رُوح" ہے۔ وُہ اصُولِ موضُوعہ اند قرار ذیل ہیں:-

(۱) جہاں کہیں بائبلِ مُقدّس میں اس قسم کی آیت مل جائے کہ "انسان اور حیوان دونوں میں ایک ہی رُوح یا ایک ہی سانس یا ایک ہی دم" ہے تو آپ سمجھ لیں کہ اس سے مُراد وُہ رُوح یا سانس یا دم ہے جو انسان و حیوان دونوں میں مُشترک ہو، اور وُہ رُوحِ حیوانی ہے نہ کہ رُوحِ اِنسانی، کیونکہ رُوحِ حیوانی دونوں میں مُشترک ہے، نہ کہ رُوحِ اِنسانی۔

(۲) بائبلِ مُقدّس نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ حیوانات میں مُطلق تعقّل کا مادہ نہیں ہے۔ مثلاً:-

"لیکن یہ لوگ بے عقل جانوروں کی مانند ہیں جو پکڑے جانے اور ہلاک ہونے کے لئے حیوانِ مُطلق پیدا ہوتے ہیں" (۲-پطرس ۲: ۱۲)۔

"اور جن کو بے عقل جانوروں کی طرح طبعی طور پر جانتے ہیں اُن میں اپنے آپ کو خراب کرتے ہیں" (یہوداہ آیت ۱۰)

"تم گھوڑے یا خچر کی مانند نہ بنو جن میں عقل نہیں" (زبور ۳۲: ۹)

عقل رُوح کا خاصہ ہے، بلکہ خُود رُوح ہے۔ چونکہ حیوانات میں رُوح نہیں ہے اس لئے اُن میں عقل بھی نہیں ہے۔

(۳) اگر انسانوں اور حیوانوں میں ایک ہی قسم کی رُوح ہوتی تو حیوان بھی انسانوں کی طرح مُکلّف[1] ہوتے حالانکہ حیوانات مُکلّف نہیں ہیں۔ مثلاً حیوانات کے لئے زنا کوئی چیز نہیں ہے اور انسانوں کے لئے یہ بدترین گُناہ ہے۔

(۴) حیوانات میں نہ تو نیکی اور بدی کا امتیاز ہے، اور نہ وُہ اپنے افعال کے جواب دہ ہیں، کیونکہ ان میں رُوح نہیں ہے۔ لیکن انسان میں نیکی اور بدی میں امتیاز کی طاقت بھی ہے اور اپنے افعال کا جوابدہ بھی ہے کیونکہ اس میں رُوح ہے۔

(۵) ڈاکٹر چالمرز مچل صاحب Dr. Chalmers Mitchell جو ایک بہت بڑے سائنسدان ہیں، اپنی مشہور کتاب Evolution and the War میں اس بحث کے ضمن میں کہ آیا

[1] مُکلّف اُس شخص کو کہتے ہیں جس پر قوانینِ الٰہی کے احکام جاری ہو سکیں اور وُہ اُس کا ذمہ دار ہو۔ (مترجم)

انسانی کا سرچشمہ حیوانی ہے۔ اور کیا مادالحیات (Protozsa) انسانی فطرت کی تشریح کر سکتی ہے یا نہیں؟ یوں لکھتے ہیں کہ:۔

"گو یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں اور اس پر اکثر بحث بھی ہوتی رہتی ہے کہ ہماری سرشت کی ابتداء ایک ادنےٰ شے (منی) سے ہوئی ہے لیکن انانیت کا احساس اور آزادی کا احساس ایک نہایت اہم طور پر ہم کو دیگر حیوانات سے متمیز کر دیتا ہے۔ حقائق ہمیں مجبور کر دیتے ہیں کہ ہم کہہ دیں کہ حیوانات میں جبلت کام کرتی ہے لیکن انسان میں عقل کام کرتی ہے۔ حیوانات غیر ذمہ دار ہیں لیکن انسان ذمہ دار ہے حیوانات کل کی مانند ہیں لیکن انسان آزاد ہے یا بالفاظ دیگر خدا نے حیوانات کو تو ایک خوبصورت جسم دیا ہے لیکن انسان کو ایک ناطق روح عطا کی ہے۔"

پھر آگے چل کر یوں رقم فرماتے ہیں کہ:۔

"**حیوان**۔ اس قابل نہیں کہ اپنے اعمال و افعال پر غور و خوض کر سکیں، یا ماضی و حال و استقبال میں تمیز کر سکیں۔ حیوانات کا احساس اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا ہے۔ انسان و حیوانات میں یہ ہی حدِ فاصل ہے جو ناقابلِ عبور ہے۔" پھر آگے چل کر کہتے ہیں کہ:۔

"میں ڈارون کے مسئلہ ارتقا کا بڑے زور سے قائل ہوں۔ میں آلاتِ تشریح اور خوردبین کا عاشق ہوں اور نہایت صبر سے بیرونی دنیا کے حقائق پر غور کرنے والا ہوں۔ میں مافوق الفطرت امور سے سخت متنفر ہوں۔ میں یہاں تک کہنے سے گریز نہیں کرتا کہ جس طرح جگر سے

صفرا خارج ہوتا ہے، اسی طرح دماغ سے خیالات خارج ہوتے ہیں۔
بایں ہمہ میں اس بات کو علم الحیات کی ایک حقیقت تسلیم کرتا ہوں کہ جس طرح اجرامِ سماوی انسان سے جُدا گانہ ایک خارجی شے ہیں، اور فی الواقع یقینی و اذعانی ہیں، اسی طرح اخلاقی قانون ایک ایسی حقیقت ہے جو انسان سے جُدا اور خارجی شے ہے۔ یہ اخلاقی قانون کسی ایک شخص یا قوم میں محفوظ مقام نہیں رکھتا ہے، بلکہ نسل در نسل انتہائی جدو جہد اور خون آلودہ آنسوؤں کا نتیجہ ہے۔ یہ انسان میں فطرتی ودیعت نہیں بلکہ انسان کی روایات و رسومات، علم ادب اور دینیات میں پایا جاتا ہے۔ انسان کی عظمت اس کے خلق اور پرورش میں ہے اور اخلاقی قانون کا احساس اس کو دیگر حیوانات سے بلند و بالا کر دیتا ہے۔" سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ :-

آدمی را عقل باید در بدن ورنہ جاں در کالبد دارد حمار

یعنی "انسان میں عقل چاہیئے۔ زندگی تو گدھے میں بھی ہے۔"

پھر ایک جگہ اور فرماتے ہیں کہ :-

ع بہ نطق آدمی بہتر است از دواب

یعنی "عقل کے لحاظ سے انسان حیوانوں سے بہتر ہے۔"

افسوس کہ جس نکتہ کو غیر مسیحیوں نے بہ ادنےٰ تامل سمجھ لیا اُس کو سینچری فرقہ نے بائبل مقدس پڑھ پڑھ کر بھی نہ سمجھا۔

تنفّس

قیام جسم خاکی ہے نفس پر ہوا پر ہے بنا اپنے مکاں کی

رُکنِ دوم
تنفّس یا سانس لینا

قسطِ گذشتہ میں زندگی میں زندگی کے رُکن اوّل یعنی خُون کے متعلق تشریح و توضیح حوالۂ قلم کی گئی تھی۔ اس قسط میں زندگی کے رُکن دوم یعنی تنفّس یا سانس لینے کے متعلق بحث کی جائے گی۔ چُونکہ سینچری فرقہ کو اس کے سمجھنے میں بھی غلطی ہُوئی ہے، لہٰذا اس پر زیادہ تفصیل کے ساتھ بحث کروں گا، اور آخر میں بائبل مُقدّس کی اُن آیات کی تشریح کروں گا جن سے یہ فرقہ استدلال کیا کرتا ہے۔

ضرُورتِ تنفّس

ہم سانس کیوں لیتے ہیں؟ جب زندگی کی حالت میں جسمِ انسان کا ہر ایک عُضو اپنے کام میں مصرُوف رہتا ہے، تو ظاہر ہے، کہ اس کام میں جسم کا کچھ نہ کچھ حصّہ ضرُور تحلیل ہوتا رہتا ہے۔ ایسی صُورت میں دو باتوں کی ضرُورت ہے۔ ایک تو یہ کہ جسم میں بدل مایتحلل ہو یعنی جسم کا جو حصّہ تحلیل یا صرف ہو گیا ہے، اُس کا بدل حاصل ہُوا اور دُوسرے یہ کہ جسم میں جو فضلات پیدا ہو گئے ہوں وُہ خارج کئے جائیں۔ پس جب خُون دَورہ کرتا ہُوا مختلف اعضائے جسم میں سے گذرتا ہے تو یہ اعضاء جس طرح خُون میں سے بعض مفید مُواد کو جذب کر لیتے

ہیں، اسی طرح اپنے فضلات کو خون میں شامل کر لیتے ہیں، اس لئے یہ ضروری ہے کہ خون کے جو اجزائے مفیدہ پرورشِ جسم میں صرف ہوتے ہیں، ان کا بدل خون میں پہنچتا رہے اور ان کے فضلات خارج ہوتے رہیں۔ چنانچہ پہلا فعل تو اعضاء ہضم سے پورا ہوتا ہے جو خلاصۂ غذا کو بطور بدل ما یتحلل خون میں داخل کر دیتے ہیں اور دوسرا فعل اعضاء تنفس یعنی فضلات کو خارج کرنے والے اعضاء مثلاً آنتیں، گردے، مثانہ، جلد اور پھیپھڑوں سے انجام پاتا ہے۔ ان فضلاتِ بدنیہ میں بخارات دخانیہ Carbon Dioxide کو جو خون میں شامل ہوتے ہیں نہایت درجہ اہمیت حاصل ہے۔ پس تنفس اور پھیپھڑوں کا بہت بڑا فائدہ یہی ہے کہ وہ بخاراتِ دخانیہ کو خون سے خارج کرتے ہیں اور آکسیجن Oxygen یا نسیم کو خون میں شامل کرتے ہیں جس سے خون صاف اور سرخ ہوتا ہے اور براہ شرائین تمام اعضائے جسم میں پھیل کر ان کی پرورش کرتا اور ان میں روحِ حیوانی پہنچاتا ہے لیکن مختلف اعضاء کے عروقِ شعریہ Capillaries میں پہنچ کر وہ کثیف اور سیاہی مائل ہو جاتا ہے، جس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ اس میں بخارات دخانیہ مل جاتے ہیں جو پھر پھیپھڑوں میں بذریعہ تنفس خون سے خارج ہوتے ہیں۔ اس لئے تنفس کے بغیر زندگی محال ہے۔ سعدی علیہ الرحمۃ نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔ کہ "ہر نفسے کہ فرو مے رود ممد حیات است وچوں برمے آید مفرح ذات" یعنی جو سانس اندر جاتا ہے وہ زندگی

کو بڑھاتا ہے اور جو باہر آتا ہے وہ مفرح ذات ہے۔

ہم سانس کس طرح لیتے ہیں

جوفِ سینہ میں ایک ایسا خلا ہے کہ بیرونی ہوا کے ساتھ براہ راست اس کا کوئی تعلق نہیں۔ سینہ کے اس خلاء میں دونوں پھیپھڑے دو تھیلیوں کی طرح رکھے ہوئے ہیں جن کا تعلق بیرونی ہوا سے فقط قصبۂ ریہ (Wind pipe) کے ذریعہ ہے۔ حرکت تنفس یعنی سانس کا آنا جانا سینہ کے بار بار سکڑنے اور پھیلنے کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ دم کھینچنے میں خاص عضلات سینہ و شکم کی امداد کے سبب جب سینہ پھیل جاتا ہے تو پھیپھڑوں اور جوفِ سینہ کے درمیان ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ پس بیرونی ہوا بذریعہ تنفس پھیپھڑوں میں جا کر ان کو پھیلا کر سینہ کو بھر دیتی ہے۔ اسی طرح جب سینہ پھیلنے کے بعد اپنی معمولی حالت پر واپس آتا ہے، یعنی جب عضلاتِ سینہ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں تو سینہ میں فضا تنگ ہو کر ہوا کو دباتی ہے۔ پس جو ہوا سانس کے ذریعہ اندر گئی تھی وہ اب دب کر باہر نکل آتی ہے۔ اسی کا نام حرکتِ تنفس ہے۔ اس حرکتِ تنفس میں بھی اللہ نے عجیب حکمت رکھی ہے۔ سینہ کا سکڑنا اور پھیلنا، عضلات کے فعل پر موقوف ہے۔ سانس لینے میں سینہ خوب کشادہ اور عمیق ہو جاتا ہے۔ کیونکہ حجابِ حاجز (Diaphragm) جب سکڑ کر نیچے اترتا ہے، تو سینہ لمبائی میں بڑھ جاتا ہے اور پسلیوں کے درمیانی عضلات کے سکڑنے سے سینہ چوڑائی میں بڑھ جاتا ہے۔ پھر

جب یہ عضلات ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، یعنی اپنی اصلی حالت پر لوٹ آتے ہیں، نیز پسلیاں اور سینہ کی ہڈی بھی لچک کے سبب اپنی معمولی حالت پر لوٹ آتی ہے تو سینہ کی اندرونی فضا۔ لمبائی اور چوڑائی میں گھٹ کر تنگ ہو جاتی ہے اور ہوا خارج ہو جاتی ہے۔ یہ معمولی حرکت تنفس ہے۔

حرکاتِ تنفس

تنفس کی دو حرکتیں ہوتی ہیں۔ پہلی حرکت جس سے ہوا اندر جاتی ہے۔ اس کو عربی میں زفیر اور انگریزی میں (Inspiration) کہتے ہیں۔ اور دوسری حرکت جس سے ہوا باہر آتی ہے اس کو عربی میں شہیق اور انگریزی میں Expiration کہتے ہیں۔ پہلی حرکت دوسری حرکت کی نسبت کسی قدر چھوٹی ہوتی ہے۔ اور دوسری حرکت یعنی اخراجِ تنفس کے بعد خفیف سا وقفہ ہوتا ہے۔

تنفس پر اعصاب کا اثر

حرکتِ تنفس طبعی اور غیر اختیاری ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو زندگی ہمیشہ خطرہ میں رہتی اور نیند یا بے ہوشی میں موت واقع ہو جایا کرتی۔ لیکن یہ بھی ضروری تھا کہ تنفس کا ایک حصہ اختیاری ہوتا، ورنہ بولنا اور گانا وغیرہ ارادی حرکات ناممکن ہو جاتیں۔ حرکاتِ تنفس اور ان کا طبعی نظام راس النخاع یعنی Medulla Oblongata کے ماتحت ہیں۔ جو ضرورتِ تنفس سے متاثر ہو کر عضلاتِ حرکت میں قوتِ تحریک بھیجتا ہے۔ لیکن تنفس کے وہ کام جو ارادی ہیں۔ ان میں راس النخاع کے علاوہ دماغ بھی شریک ہوتا ہے، لیکن تمام عضلاتِ تنفس کا مرکز راس النخاع ہی ہے جو تمام

عضلاتِ تنفس پر حکمران ہے۔

مرکزِ تنفس یہ راس النخاع کے تقریباً درمیانی حصہ میں ہوتا ہے۔ اگر اس حصہ میں پہنچے تو تنفس فی الفور بند ہو جاتا ہے اور موت واقع ہوتی ہے، اس لئے اس کو مرکزِ حیات بھی کہتے ہیں۔ یہ مرکزِ تنفس یا مرکزِ حیات کس طرح کام کرتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ بلا کسی تحریک کے خود بخود کام کرتا ہے اور بعض کا خیال ہے کہ دیگر اعصابِ حسیہ کا اس پر اثر پڑتا ہے، جو اس میں تحریک کا باعث ہوتا ہے لیکن بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اس مرکز کی تحریک کا باعث وہ خون ہے جو کہ یہاں پہنچتا ہے[1] یعنی جب خون میں بخاراتِ دخانیہ زیادہ ہوتے ہیں تو اس مرکز میں تحریکِ تنفس پیدا کرتے ہیں اور جب کم ہوتے ہیں تو اس مرکز کا فعل سست ہو جاتا ہے۔ اگر اس خون میں آکسیجن یعنی نسیم زیادہ ہو تو اس مرکز کا فعل رک جاتا ہے۔

میری دانست میں مسئلہ تنفس پر میں زیادہ لکھ چکا ہوں۔ مزید روشنی ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہاں صرف یہ لکھنا کافی ہے کہ اگر آپ بیانِ مافوق پر ایک غائر نظر ڈالیں تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ تنفس یعنی دم لینا یا سانس لینا تمام حیوانات میں خواہ وہ انسان ہو یا حیوانِ مطلق حتیٰ کہ نباتات میں بھی مشترک ہے اور ان کی زندگی مستعار

---

[1] ہمارے نزدیک اس کی محرک روح ہے، کیونکہ روح ہی دماغ سے کام لیتی ہے۔ (مترجم)

A short course in Biology, Human antatomy and physiology.

کو چند دنوں تک اور قائم رکھنے کا صرف ایک وسیلہ ہے اور ایسا کمزور وسیلہ جس کی بنیاد اور چیزوں پر قائم ہے۔ میں گذشتہ دو قسطوں میں بالتفصیل بیان کر چکا ہوں کہ انسان میں صرف زندگی نہیں ہے بلکہ زندگی کے علاوہ ایک اور قابلِ اعتنا چیز بھی ہے جو دیگر حیوانات و نباتات میں نہیں جس کو روح کہتے ہیں۔ پس تنفس کا تعلق انسان کے اس حصہ کے ساتھ ہے جس کو ہم مادی حصہ کہتے ہیں۔ پس یہ کہنا کہ انسان میں بجز زندگی کے "دم یا سانس" کے اور کوئی چیز نہیں ہے، گویا یہ کہنا ہے کہ انسان مادہ کے مختلف ذرات کا ایک مجموعہ ہے اور جس طرح کہ یہ ذرات ایک نہ ایک دن مٹ کر فنا ہو جائیں گے، اسی طرح انسان بھی ایک نہ ایک دن مٹ کر فنا ہو جائیں گے۔ چنانچہ سنیچری فرقہ کا یہی اعتقاد ہے۔ ذیل میں ان کی ایک مستند کتاب "بائبل کی تعلیم" سے ایک اقتباس نقل کرتا ہوں جو از قرارِ ذیل ہے:۔

س۔ "جو زندگی کا دم انسان میں ڈالا گیا ہے، کیا وہی تمام جانداروں میں ڈالا گیا ہے؟"

ج۔ "یہی زندگی کا دم تمام جانداروں کو عنایت کیا گیا ہے اس کے لیے دیکھئے پیدائش ۷: ۱۵، ۲۱-۲۲۔ واعظ ۳: ۱۹۔

س۔ کیا انسان اور حیوان دونوں کا مدار ایک ہی سانس پر ہے؟

ج۔ "جس طرح یہ مرتا ہے اسی طرح وہ مرتا ہے۔ ہم سب میں ایک ہی سانس ہے" واعظ ۳: ۱۹، ایوب ۱۲: ۷-۱۰۔

س :- "جب یہ دم انسان میں سے نکل جاتا ہے تو اس کا کیا حال ہوتا ہے"؟
ج :- "اُس کا دم نکل جاتا ہے۔ وُہ اپنی مٹی میں پھر جاتا ہے۔ اُسی دن اُس کے منصوبے فنا ہو جاتے ہیں" زبور ۱۴۶: ۴، ایوب ۳۴: ۱۴-۱۵، پیدائش ۳: ۱۹؛ زبور ۱۰۴: ۲۹، واعظ ۱۲: ۷۔

اقتباسِ مافوق کو پڑھ کر آپ ضرور متعجب اور حیران ہوئے ہوں گے کہ آخر وُہ کونسا کمبخت اور کندۂ ناتراش انسان ہے جو اس کا قائل نہیں کہ "زندگی کے دم" کے لحاظ سے انسان اور حیوان دونوں برابر کے شریک اور ایک دُوسرے کے مساوی ہیں یا اس کو تسلیم نہیں کرتا کہ "انسان اور حیوان کی زندگی کا مدار ایک سانس" پر ہے۔ یقیناً دُنیا میں کوئی انسان ایسا احمق اور اجہل نہیں ملے گا جو عنوانات اقتباسِ مافوق سے انکار کرتا ہے۔ جب یہ کیفیت ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے عنوانات قائم کرنے کی ضرورت اس فرقۂ ضالّہ کو کیونکر لاحق ہوئی؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ فرقہ رُوح کا قائل نہیں، اس لئے ان کی تمام تر کوشش یہی رہتی ہے کہ بائبل مقدّس سے ایسی آیات پیش کریں جن سے اُن کی یہ غلط تعلیم ثابت ہو سکے کہ رُوح کوئی چیز نہیں ہے بلکہ انسان اور حیوان دونوں میں صرف "زندگی کا دم" ہے جو جسم کے ساتھ پیدا ہو کر جسم کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا انسان اور حیوان میں نہ کوئی مابہ الامتیاز ہے اور نہ ایک کو دُوسرے پر فوقیت اور ترجیح ہے جس کی تردید ہم اوراقِ گذشتہ میں کر چکے ہیں۔

اب ہم اُن آیات پر غور کریں گے جن کو اس فرقہ نے اقتباسِ مافوق میں اپنے عقیدۂ فاسدہ کی تائید میں منتخب کیا ہے۔ انہوں نے صرف بائبل مقدس کے حوالے دیئے ہیں، لیکن ہم ان کی ہر ایک محولہ آیت کو لفظ بلفظ نقل کرتے ہیں تاکہ قارئین پر ان کی بائبل دانی کی حقیقت واضح ہو جائے۔ ان کے حوالجات از قرارِ ذیل ہیں :-

(۱) "کیونکہ جو کچھ بنی آدم پر گزرتا ہے وہی حیوان پر گذرتا ہے۔ ایک ہی حادثہ دونوں پر گذرتا ہے جس طرح یہ مرتا ہے اُسی طرح وہ مرتا ہے۔ ہاں سب میں ایک ہی سانس ہے اور انسان کو حیوان پر کچھ فوقیت نہیں کیونکہ سب بُطلان ہے"۔ (واعظ ۳: ۱۹)

(۲) "اور جو زندگی کا دم رکھتے ہیں اُن میں سے دو دو کشتی میں نُوح کے پاس آئے"۔ (پیدائش ۷: ۱۵)

(۳) "اور سب جانور جو زمین پر چلتے تھے۔ پرندے اور چوپائے اور جنگلی جانور اور زمین پر کے سب رینگنے والے جاندار اور سب کے سب آدمی مر گئے"۔ (پیدائش ۷: ۲۱)

(۴) "اور خشکی کے سب جاندار جن کے نتھنوں میں زندگی کا دم تھا مر گئے"۔ (پیدائش ۷: ۲۲)

(۵) واعظ ۳: ۱۹ (اس آیت کو میں نے لفظ بلفظ نمبر اوّل میں نقل کیا ہے)۔

(۶) "حیوانوں سے پوچھ اور وہ تجھے سکھائیں گے اور ہوا کے پرندوں سے دریافت کر اور وہ تجھے بتائیں گے"۔ (ایوب ۱۲: ۷)۔

(۷) "یا زمین سے بات کر اور وُہ تجھے سکھائے گی اور سمندر کی مچھلیاں تجھ سے بیان کریں گی۔" (ایوّب ۱۲: ۸)

(۸) "کون نہیں جانتا کہ ان سب باتوں میں خُداوند کا ہاتھ ہے جس نے یہ سب بنایا۔" (ایوّب ۱۲: ۹)

(۹) "اُسی کے ہاتھ میں ہر جاندار کی جان اور کُل بنی آدم کا دَم ہے۔" (ایوّب ۱۲: ۱۰)

(۱۰) "اُس کا دم نکل جاتا ہے تو وُہ مٹی میں مل جاتا ہے۔ اُسی دن اس کے منصوبے فنا ہو جاتے ہیں۔" (زبور ۱۴۶: ۴)

(۱۱) "اگر وُہ انسان سے اپنا دل لگائے۔ اگر وُہ اپنی رُوح اور اپنے دم کو واپس لے لے۔" (ایوّب ۳۴: ۱۴)

(۱۲) "تو تمام بشر اکٹھے فنا ہو جائیں گے اور انسان پھر مٹی میں مل جائیگا۔" (ایوّب ۳۴: ۱۵)

(۱۳) "تُو اپنے مُنہ کے پسینے کی روٹی کھائے گا۔ جب تک کہ زمین میں تُو پھر لَوٹ نہ جائے اس لئے کہ تُو اس سے نکالا گیا ہے۔ کیونکہ تُو خاک ہے اور خاک میں پھر لوٹ جائے گا۔" (پیدائش ۳: ۱۹)

(۱۴) "تُو اپنا چہرہ چھپا لیتا ہے اور یہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ تُو ان کا دم روک لیتا ہے اور یہ مر جاتے ہیں اور پھر مٹی میں مل جاتے ہیں۔" (زبور ۱۰۴: ۲۹)

(۱۵) "اور خاک خاک سے جا ملے جس طرح آگے ملی ہوئی تھی اور رُوح خُدا کے پاس جس نے اُسے دیا تھا، واپس جائے۔" (واعظ ۱۲: ۷)۔

یہ ہے ان کُل آیتوں کا میزان جن کو سیلیچری فرقہ اس مضمون کے متعلق سند کے طور پر پیش کیا کرتے ہیں۔ ان میں بہت سی ایسی آیتیں ہیں جن کی توضیح و تشریح ہم سابقاً کر چکے ہیں۔ مثلاً:-

حوالہ نمبر ۱، ۲، ۳، ۵ و حوالہ نمبر ۶، ۷، ۸ و ۹ کی اوراقِ گذشتہ میں تشریح کر چکے ہیں۔

حوالہ نمبر ۱۱، ۱۲ و ۱۵ پر اوراق گذشتہ میں بحث کر چکے ہیں۔

صرف حوالہ نمبر ۴، ۱۰، ۱۳ و ۱۴ باقی ہیں جن پر ہم ذیل میں بحث کرینگے۔

حوالہ نمبر ۴ - یہ وہی آیت ہے جس کے متعلق گذشتہ قسط میں ہم نے وعدہ کیا تھا کہ بحثِ تنفس میں اس پر بحث کریں گے۔ اس آیت میں اصلی عبرانی میں ایک عجیب جملہ (נִשְׁמַת־רוּחַ חַיִּים) واقع ہوا ہے۔ جس کو نہ تو انگریزی مترجمین نے لفظ بلفظ ترجمہ کیا ہے اور نہ اُردو مترجمین نے، دونوں نے اس کا ترجمہ "زندگی کا دم" کیا ہے لیکن عربی مترجمین نے اس کا نہایت صحیح ترجمہ یُوں کیا ہے کہ "نسمۃ رُوحِ حیات" یہاں "نسمہ" (נָשַׁם) سے مشتق ہے جس کے معنی زور سے سانس لینے، ہانپنے اور دھڑکنے کے ہیں۔ چنانچہ اسی لفظ کا صیغہ مستقبل یسعیاہ ۴۲: ۱۴ میں آیا ہے کہ:-

"مَیں بہت مدّت سے چُپ رہا۔ مَیں خاموش ہو رہا اور ضبط کرتا رہا پر اب مَیں دردِ زہ والی کی طرح چِلاّؤنگا اور زور زور سے سانس لُونگا"۔

پس نسمہ "رُوحِ حیات" کا صحیح ترجمہ "رُوحِ حیوانی کی دھڑک" یعنی جلد جلد

حرکت کرنے کے ہیں۔ پس یہاں "نسمہ" یا "رُوح" سے وُہ رُوح مُراد نہیں جو صرف انسانوں میں ہے، بلکہ اس سے مُراد صرف زندگی ہے جو انسان اور حیوان دونوں میں ہے جس کی تفصیل ہم گذشتہ اوراق میں کر چکے ہیں۔

حوالہ نمبر ۱۰۔ بیشک ہمارا بھی ایمان ہے کہ انسان کی زندگی جب ختم ہو جاتی ہے تو اُس کی رُوح اس سے علیحدہ ہو جاتی ہے اور اس کا مادی حصّہ یعنی جسم خاک ہو کر خاک میں مل جاتا ہے۔ اس آیت سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رُوح بھی جسم کے ساتھ مر کر خاک میں مل جاتی ہے۔

حوالہ نمبر ۱۳۔ یہ انسان کے مادی حصّہ کے متعلق ہے۔ یعنی اس حصّہ کے متعلق جو زمین سے بنایا گیا تھا۔ (پیدائش ۲: ۷) نہ اُس حصّہ کے متعلق جس کو خُدا نے اپنی طرف سے اس میں ڈال دیا تھا۔ ہم اس کتاب کے آغاز میں بالتفصیل بیان کر چکے ہیں کہ بائبل مُقدّس کی رُو سے انسان کے دو حصّے ہیں۔ (۱) مادی اور (۲) غیر مادی۔ مادی حصّہ خاک ہو کر خاک میں مل جاتا ہے اور غیر مادی حصّہ یعنی رُوح خاک نہیں ہوتی بلکہ خُدا کے پاس جاتی ہے۔

حوالہ نمبر ۱۴۔ اس زبُور میں اوّل سے آخر تک خُدا کی خالقیت اور اُس کی عظمت اور جلال کا بیان کرتے ہُوئے حضرت داؤد بری اور بحری حیوانات کے متعلق فرماتے ہیں، کہ یہ بھی خُدا کی مخلُوق اور دستِ نگر ہیں، اور اُن کی زندگی خُدا ہی کے قبضۂ اختیار میں ہے۔ چُونکہ اس آیت

محولہ میں صرف حیوانات وحشرات کا بیان ہے۔ لہٰذا اس آیت میں لفظ "دم" سے ان کی حیوانی "زندگی" یعنی رُوح حیوانی مُراد ہے نہ یہ کہ ان میں بھی انسانی رُوح ہے۔ مزید تفصیل کے لئے گذشتہ اوراق ملاحظہ ہوں۔

خُدا کے لُطف و کرم سے ہم ان تمام آیتوں کی صحیح تفسیر و تشریح سے فارغ ہو چکے، جن سے سنیچری یہ استدلال کرتے ہیں کہ انسانوں میں کوئی علیحدہ رُوح نہیں ہے، بلکہ جو حیوانوں میں ہے وُہی انسانوں میں ہے۔ یعنی دونوں میں صرف "زندگی کا دَم" ہے اور بس اور "زندگی کے دم" کی جو تفسیر کرتے ہیں، اس کی تردید ہدیۂ ناظرین ہو چکی ہے۔

اس فرقہ ضالہ کی ٹھوکر پر ٹھوکر کھانے کی وجہ یہ ہے کہ یہ عوام کالانعام کی طرح "زندگی" اور "رُوح" میں تمیز نہیں کر سکتے ہیں اور جب تک یہ ان دو باتوں میں تمیز کرنے کے اہل نہ ہو جائیں اُس وقت تک اسی طرح سر کے بل گرتے جائیں گے۔ چنانچہ انگلستان کے ایک بڑے سائنسدان پروفیسر شیفر نے ۴ ستمبر ۱۹۱۲ء اسکاٹ لینڈ کے شہر ڈنڈی میں برٹش ایسوسی ایشن کی ۸۲ ویں سالگرہ کے جلسہ میں "اصل حیات" پر ایک افتتاحی خطبہ پڑھا جو اخبار لندن ٹائمز مورخہ ۶ ستمبر میں شائع ہوا ہے۔ ذیل میں ہم اس کے اُس حصہ کا جس کا تعلق "حیات" یعنی زندگی کے ساتھ ہے، ترجمہ درج کرتے ہیں:۔

"حیات کیا ہے؟ اس کو ہر شخص جانتا یا سمجھتا ہے کہ میں جانتا ہوں، لیکن کوئی بھی اس کی صحیح تعریف نہیں کر سکتا۔ مشکل یہ ہو گئی ہے کہ لوگوں

نے رُوح اور زندگی کو مترادف سمجھ لیا ہے۔ اس وقت جو کچھ میں زندگی کے متعلق کہتا ہوں، اس سے یہ ہرگز نہ سمجھنا کہ جس معنی میں رُوح کا اطلاق ہوتا ہے اس پر لفظ "زندگی" منطبق ہے کیونکہ رُوح کا تصور زندگی کے تعلق سے پیدا ہوتا ہے، اس لیے رُوح اور زندگی کو لوگوں نے ہم معنی سمجھ لیا ہے۔ لیکن جب تک رُوح سے اس کے تمام مختص علامات علیحدہ نہ کر دیے جائیں اُس وقت تک رُوح اور زندگی کو دو جداگانہ تصور سمجھنا چاہیئے، کیونکہ زندگی کا معمّی دراصل مادہ کا معمّی ہے اور ہم زندگی کو سائنٹیفک معنی میں کبھی مادہ سے علیحدہ تصور نہیں کر سکتے ہیں۔"

اسی وجہ سے میں نے بھی زندگی اور رُوح کے جُداگانہ تصور پر گذشتہ اوراق میں زیادہ تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے تاکہ اُن کو جو اس وقت تک اس تفریق سے واقف نہیں ہیں اور انسان و حیوان میں تمیز نہیں کر سکتے، راہِ راست پر آنے کی توفیق نصیب ہو۔

کُتبِ مُستوجبِ الثّوب
۲۰۱۵

حصّہ دوم

نابُود شُدہ اقوام اَور رُوح

اگر آپ نابُود شُدہ اقوام کی مذہبی تاریخ کے مطالعہ کرنے میں دردِ سر محسوس نہ کریں، تو آپ دیکھ لیں گے کہ دُنیا میں کوئی قوم کسی نہ کسی زمانہ میں ایسی نہیں گذری ہے جس کا یقین رُوح کی ہستی اَور حیات بعد الممات[1] پر نہ ہو، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح یہ یقین انسانی فطرت کا جزو لاینفک بن گیا ہے۔ چنانچہ اس دعویٰ کے ثبوت میں ہم ان اقوام میں سے بابلی۔ مصری۔ زرتشتی۔ ہندی اَور یُونانی معتقدات ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں :-

بابلی مُعتقدات

بابلیوں کا اعتقاد تھا کہ انسانی رُوح لافانی ہے، کیونکہ "خالق نے اُن کو اپنے خُون سے خلق کیا"

---

[1] سر جیمس فریزر Sir James Frazer کہتے ہیں کہ "وحشی اقوام میں حیات بعد الممات کسی تخیل یا اُمید و بیم کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسا یقینی امر ہے جس میں کوئی شخص شک نہیں کرتا ہے جس طرح کہ وہ اپنی ہستی پر شک نہیں کرتا ہے وہ بغیر کسی تامل اَور بغیر کسی استفسار کے اس بات کو فرض کر لیتا ہے گویا وہ انسانی تجربہ کی حدود میں سب سے زیادہ مسلّمہ حقیقت ہے"۔

The idea of Immortality by Pringle Pattison.

ہیں۔ چونکہ خالق کا خون لافانی ہے اس لئے ارواح بھی لافانی ہیں اور بظاہر قدرت میں کوئی چیز ایسی نہیں جس میں اچھی یا بری روح نہ ہو۔ انسانوں کا یہ فرض ہے کہ ان بد ارواح کو بذریعہ نذر و نیاز خوش رکھیں اور کوشش کریں کہ نیک ارواح سے استفادہ کریں۔ ان کے نزدیک بری ارواح کوئی جداگانہ خلقت نہیں ہے بلکہ یہی انسانی ارواح ہیں جو بعد از مفارقتِ بدن کسی نہ کسی وجہ سے اپنے مقام میں داخل نہیں ہو سکتی ہیں۔ تب وہ بغرضِ انتقام بالعموم سب کو اور بالخصوص اپنے رشتہ داروں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی ہیں۔ جب روح بدن سے علیحدہ ہو جاتی ہے۔ اگر اُسی وقت اُس کی لاش کو باقاعدہ دفن نہ کیا جائے یا اُس کی رسومات پورے طور سے ادا نہ کی جائیں یا اُس کی لاش کو غیر ملک میں دفنایا جائے تو وہ روح عالمِ ارواح میں نہیں جا سکتی، بلکہ اِدھر اُدھر پریشان پھرتی رہتی ہے۔ اس لئے وہ اُن لوگوں سے انتقام لینے کی کوشش کرتی ہے جن کی غفلت کی وجہ سے وہ اپنے آرام دہ مقام میں داخل ہونے سے رہ گئی ہے۔ اس قسم کی ارواح میں سب سے زیادہ مشہور نامتارو (Namtaru) ہے جو سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ دوسری اُتُکو (Utukku) ہے۔ یہ اُن لوگوں کو ستاتی رہتی ہے جو بیابانوں اور جنگلوں میں رہتے ہیں۔ اس کی ساتھی ایک تیسری روح ہے جس کو ایکیمو (Ekimmu) کہتے ہیں۔ یہ تمام ردّی زمین پر چکر لگاتی رہتی ہے اور جس کو پاتی ہے ضرر پہنچاتی ہے جن سے اس کا بحالتِ حیات کچھ نہ کچھ تعلق تھا، کیونکہ ان کے سبب

وُہ اپنے آرام کے مقام میں داخل نہ ہو سکی۔

نیز ان کا اعتقاد تھا کہ وبا۔مری۔کال۔آندھی۔طُوفان۔جنُون۔بُخار۔دَردِ سر۔اندھا پن وغیرہ سب انہی بد رُوحوں کے طفیل سے آتے رہتے ہیں۔چنانچہ لبارتو (Labartu) و نامترُو (Namtaru) وبا کے مؤکل ہیں اور اشکّو (Ashakku) سخت بُخار پھیلاتی ہے وغیرہ۔

جنّت اُور دوزخ پر بھی یہ یقین رکھتے تھے۔ان کے نزدیک جنّت کے کئی نام تھے۔مثلاً "درخشاں آسمانی مُلک" "نقرئی آسمان" "زندگی کا مُلک" اُور "زندگی کا مکان"۔ جو نیک بابلی مرتا تھا اُس کی رُوح براہ راست جنّت میں داخل ہوتی تھی اُور وہاں زمانۂ پیشین کے بزرگوں بہادروں اُور بادشاہوں کی اَرواح کے ساتھ مساویانہ طور پر عیش وعشرت میں رہتی تھی۔سپاہیوں کی ارواح صوفوں پر بیٹھ کر اپنے دوستوں کے ساتھ "پاک شراب" پی کر مگن رہا کرتی تھیں۔

دوزخ کے متعلق ان کا خیال تھا کہ زمین کے اندر ایک عمیق اُور بے حد تاریک اُور بے حد وسیع غار ہے جس کے اندر ایک دریا بھی ہے جس پر رُوحوں کا گذرنا ضروری ہے۔اس کی چاروں طرف سات دیواریں اُور سات دروازے ہیں جو ہر وقت مقفل رہتے ہیں۔اس کے دربان بھی ہیں جو صرف اُنہیں اُن رُوحوں کے لئے کھول دیتے ہیں جو دُنیا سے آتی ہیں اُور پھر بند کر دیتے ہیں۔یہاں کے رہنے والوں کا کھانا پینا مٹّی اُور کیچڑ ہے۔بابلی لوگ رُوحوں کے لئے مردُک کے حضور یُوں دُعا کرتے

تھے کہ :-

"اَے خُدا جس کا توکّل تجھ پر ہے تو اُس کی رُوح کو نفع پہنچاتا ہے"۔

بابلی مذہب کے متعلق کُل بیانِ مافوق ذیل کی دو مشہور و معرُوف اور مُستند کتابوں سے ماخوذ ہے:-

(1) Immortality and the Unseen World,
by W. O. Oesterley D.D.

(2) Babylonian Life and History, by E. A. Wallis

مصری معتقدات

مصریوں کا عقیدہ تھا کہ رُوح غیر فانی ہے اور اُس کو اس دُنیا کے اعمال کے موافق عقبیٰ میں سزا و جزا ملتی ہے۔ وُہ تناسخ کے بھی قائل تھے، اس لئے جانوروں تک کی تعظیم اور پرستش کرنے لگے تھے۔ مگر مصریوں اور ہندوؤں کا تناسخ کے متعلق ایک بات میں اختلاف ہے۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ جو لوگ گناہ کی زندگی بسر کرتے ہیں اُنہی کی رُوح کو تناسخ میں اعلےٰ ہستی سے ادنےٰ ہستی ملتی ہے لیکن مصریوں کا عقیدہ تھا کہ ہر انسان کی رُوح کو اپنی مُدّتِ حیات میں تمام ذی رُوح مخلُوق کے جسم میں رہنا اور پھر انسان کے جسم میں آجانا چاہیئے۔ چُونکہ تین ہزار سال میں تناسخ کا ایک دَور ختم ہوتا ہے، اس لئے مصر کے لوگ لاشوں کو خُوشبودار مصالحہ سے محفُوظ کیا کرتے تھے تاکہ جب پھر رُوح لوٹ کر آئے تو جسم اُسے قبُول کر سکے۔

مصریوں کا عقیدہ تھا کہ عقبیٰ میں مسرت اس دُنیا میں نیک اعمال کرنے پر ملتی ہے۔ ۷۲ دِن تک مُردے کا ماتم کیا جاتا تھا۔ اتنے دِن لاش مصالحہ لگانے والوں کے پاس رہتی تھی۔ اس کے بعد رشتہ داروں کے پاس ایک مہینہ یا ایک سال رہتی تھی۔ جہاں مُردے کی رُوح کو دعوتیں دی جاتی تھیں۔ اس کے بعد لاش کو مقدس جھیل کے کنارے لے جاتے تھے۔ وہاں بیالیس آدمی بیالیس صُوبوں یا بیالیس دیوتاؤں کے قائم مقام بن کر یہ فیصلہ کرتے تھے کہ آیا مرحوم کو عقبیٰ میں مسرت ملنی چاہیئے یا غم و رنج۔ ایک میزان کھڑی کی جاتی تھی جس میں ایک طرف درستی کی مُورت رکھی جاتی تھی اور دُوسرے میں مُردے کے اعمال ایک بند بوتل میں۔ اگر اُس کے اعمال کا پلّہ بھاری ہوتا تھا تو اُسے اپنے صُوبہ کی جھیل کے پار لے جاکر دفن کیا جاتا، ورنہ جھیل کے اس پار یہ رسم دیوتاؤں کی مجلسِ انصاف کی تقلید میں کی جاتی تھی، کیونکہ دیوتاؤں کی مجلس میں بیالیس دیوتا مِل کر مُردے کا انصاف کرتے تھے۔ اوسائرس دیوتا اس مجلس کا سردار ہوتا تھا۔ وہاں بھی ایک میزان کھڑی کی جاتی تھی جس کے ایک پلّے میں انصاف کی مُورت اور دُوسرے میں انسان کا دِل رکھا جاتا تھا، اور پلّے کے جُھکنے پر فتوے دیا جاتا تھا۔

مُردے کی قبر پر اُس کے اعمال درج کئے جاتے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ فلاں شخص نے اپنی زندگی میں ایسے کام کئے تھے اور یہ کہ اُسے عقبیٰ میں مسرت نصیب ہُوئی یا نہیں۔

مصریوں میں یہ بھی رسم تھی کہ اُن کے مذہب کی پاک کتاب کا ایک حصہ مُردے کے ساتھ دفن کیا جاتا تھا۔

مَوت کے بعد کیا ہوتا ہے؟

(مصریوں کے عقیدے کے موافق)

جو افعال انسان سے بقیدِ حیاتِ جسمانی سرزد ہوتے ہیں اُن کی بازپرس مَوت کے بعد دیوتاؤں کی طرف سے کی جاتی ہے۔ یہ عقیدہ مصریوں کے زمانۂ تہذیب وشائستگی سے تعلق رکھتا ہے اور بعد میں بھی تمام نسلوں میں جیسا کا تیسا ہی قائم رہا۔ اس بارہ میں جس قدر شہادتیں دستیاب ہوئی ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر رُوح کے ساتھ اُس کے افعال کے مطابق سلوک کیا جاتا ہے اور یا تو اُسے مقبولوں اور نیکوکاروں کے مُلک میں جس کا فرمانروا اوسارِس ہے بھیج دیا جاتا ہے اور یا اُسے ہلاک کر دیا جاتا ہے۔

مُردوں کی عدالت کا خیال مصریوں میں ایک نہایت قدیم زمانہ سے چلا آتا تھا یہاں تک کہ شاہ مینکورا کے عہد میں جو سنہ ۳۶۰۰ قبل مسیح کے قریب تھا ایک پتھر کی پٹیا پائی گئی جس پر ایک مذہبی حکم تھوتھ دیوتا کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ یہ حکم اب "مُردوں کی کتاب" فصل ۱۲۵ (ب) میں شامل ہے۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصریوں میں مُردوں کی عدالت کا خیال رائج تھا۔ ایک اور حکم جو بعد میں "مُردوں کی کتاب" کی ایک فصیل قرار دیا گیا ہے۔ گیارھویں شاہی خاندان کے ایک تابوت پر لکھا ہوا تھا۔ بادشاہوں

کا گیارہواں خاندان مصر میں ۲۵۰۰ ق م کے قریب گذرا ہے۔ اُس سے بھی مُردوں کی عدالت کے خیال کی تصدیق و تائید ہوتی ہے۔

مُردوں کی عدالت اس طرح کی جاتی تھی کہ ایک دیوتا کے رُوبرُو مُردے کے اعمال ایک میزان میں وزن کئے جاتے تھے، یا اُس کا جسم اُس کے افعال یا دِل کے ساتھ اس طرح وزن کیا جاتا تھا کہ ایک پلڑے میں جسم رکھا جاتا تھا اور دُوسرے میں اُس کے افعال یا دل۔ عدالتِ انصاف میں داخل ہونے سے پہلے رُوح کو رآ اور اوسائرس کی ستائش کرنی پڑتی تھی اور وُہ گناہ بتانے پڑتے تھے جو اُس سے سرزد ہوئے ہوں۔ عدالت میں داخل ہوکر اُسے بیالیس دیوتاؤں کے رُوبرُو جو اوسائرس کے ماتحت ہیں یہ اِقرار کرنا پڑتا تھا کہ اُس نے فلاں فلاں گناہ نہیں کیا۔

اس کے بعد اُسے اُس عدالت میں جسے معاتی (Maati) کی عدالت کہتے ہیں داخل ہونا پڑتا تھا، جہاں اُس کا دِل ایک ترازو میں وزن کیا جاتا تھا۔ ترازو کی ایک جانب انوبس دیوتا جس کا سر گیدڑ کا سا تھا دو زانو بیٹھا ہوتا تھا۔ اُس کے پس پُشت تھوتھ دیوتا جس کا سر ایک چڑیا کا سا تھا کھڑا ہوتا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک قلم ہوتا تھا جس سے وُہ وزن لکھتا جاتا تھا۔ تھوتھ کے پاس ہی تین سر کا کتا جسے اُم میت (Amumit) کہتے ہیں بیٹھا ہوتا تھا۔ اگر دِل ذرا بھی ہلکا ہوتا تو وُہ اُسے کھا جاتا تھا۔ ترازو کی دُوسری جانب آنو اور اُس کی بیوی تھوتھو ادب کے ساتھ سر جُھکائے ہُوئے کھڑے ہوتے تھے۔ وُہ اُس وقت انسان کی شکل میں ہوتے

تھے اور انسان کے کپڑے پہنے ہوئے آتو کی رُوح باز کی شکل میں جس کا سر انسان کا سا ہوتا تھا رکھی ہوتی تھی اور یہ شئے مرحوم کا مقبرہ سمجھی جاتی تھی۔ اس کے بعد مُردے کی رُوح کو بہت سے مکانوں میں ہو کر گزرنا ہوتا تھا، جن کے دربان ایسے عفریت ہوتے تھے جو نووارد رُوح سے دشمنی رکھتے تھے۔ مزید برآں اُسے ایک کشتی میں سوار ہو کر اُن مکانوں کے دیوتاؤں کی مدد سے اُس منزلِ مقصود کو جانا ہوتا تھا جہاں کہ اُسے جانا چاہیئے تھا۔ اس کے لیئے اُسے بہت سی دُعائیں جو مُردوں کی کتاب" میں درج ہیں ٹھیک طریقہ اور صحیح تلفظ میں ادا کرنی ہوتی تھیں۔

جب رُوح کے اعمال کا حساب کتاب ہو چکتا تھا تو اوسائرس کا بیٹا ہورس (Horus) دیوتا اوسائرس کی شکل اختیار کر کے اُس رُوح کا جو راست باز ثابت تھی بایاں ہاتھ اپنے دائیں ہاتھ میں لے کر اوسائرس کی طرف جاتا تھا جو ایک تخت پر متمکن ہوتا تھا۔ اُس کے دائیں ہاتھ پہ نیفتھیز (Nephthys) اور بائیں پہ آئسس کھڑی ہوتی تھی اور سامنے کنول کے پھول کے اُوپر ہورس کے چار بچے۔ جب ہورس، اوسائرس کے حضور میں پہنچتا تو یہ کہتا تھا کہ "میں تیرے حضور میں فلاں رُوح کو لایا ہوں۔ اُس کا دِل راستباز نکلا، اُسے اپنی حضوری میں داخل کر۔" اُس وقت رُوح اوسائرس سے یُوں مخاطب ہوتی تھی "اے فرمانروا! میں تیری حضوری میں حاضر ہوں۔ مجھ میں کوئی کھوٹ اور گناہ نہیں پایا گیا۔ مجھے اپنے مقبولوں میں داخل کر لے۔" چنانچہ اوسائرس اُسے اپنے مقبولوں میں داخل کر لیتا تھا۔

جب یہ سخت امتحان گزر جاتا تھا تو اُسے پاتال کے مختلف اور متعدد دیوتاؤں سے مُلاقات کرنی ہوتی تھی، جن کی جناب میں وُہ عاجزی کے ساتھ دُعا کرتی تھی۔ اُن دُعاؤں کے ختم ہونے پر رُوح کو معاتی دیوی کی عدالت کے ہر حصّے یعنی دروازہ دہلیز وغیرہ اور دربانوں کے سوالوں کا جواب دینا ہوتا تھا، جن میں سے ہر ایک اُس سے اپنا نام دریافت کرتے تھے۔ اُن ناموں کے بتانے کے بعد رُوح پاتال کے ہر حصّے کی سیر کرتی اور جو عیش و نشاط اُن میں ہوتے ہیں اُن سے اپنے کو محظوظ و مسرور کرتی تھی۔

اگرچہ قدیم مصریوں میں دوزخ کا کوئی خیال نہیں پایا جاتا تھا جسے وُہ شیول (Sheol) کہتے تھے اُسے وُہ بدرُوحوں کا مُلک سمجھتے تھے اور اُس میں آفتاب کبھی بھی جلوہ گر نہیں ہوتا تھا۔ اس میں عفریت سکونت رکھتے تھے۔ مگر زمانۂ مابعد کے مصریوں کی دوزخ بہت سی خاص خاص باتوں میں برہمنوں کے دوزخ سے مُشابہت رکھتی ہے۔ وُہ اوسائرس کو برہمنوں کے وسروام کی مانند سمجھتے تھے۔ اُس کے محل کی حفاظت عفریت کیا کرتے تھے جن کے ہاتھوں میں آتشی ہوائیاں ہوتی تھیں۔ ان کے ہاں اکیس دوزخ مانی جاتی تھیں۔

پرم ہرو یعنی مُردوں کی کتاب جو دُنیا کی سب سے پُرانی کتاب ہے۔ اُس میں زمانۂ مابعد کے مصریوں کے دوزخ کا حال پایا جاتا ہے۔ اسی دوزخ سے شاعروں، مصوّروں، مذہبی پیشواؤں اور مدبّروں نے مختلف قوموں کی دوزخ بنالی۔

گُنہگار رُوح کو اپنے سفر میں بہت سی آفات پیش آتی تھیں۔ اُسے بدرُوحیں۔ سانپ۔ بچھو۔ زہریلے جانور۔ تکان۔ بھوک اور پیاس ستاتی تھیں۔ جب وُہ تاریک پاتال میں پہنچتی تو اُسے ایک گہری نیند آجاتی تھی جس سے وُہ کبھی بیدار نہیں ہونے پاتی تھی۔

مُردوں کی کتاب میں لکھا ہُوا ہے کہ گُنہگار رول سے ہورس یُوں کلام کرتا ہے۔ "تمہارا سر قلم کیا جائے گا۔ تُم فنا ہو جاؤ گے۔ تُمہاری رُوح ہلاک کی جائے گی۔ تُم نے میرے باپ اوسائرس کا گُناہ کیا ہے۔ اس کے عوض میں تُم مٹا دیئے جاؤ گے۔" اور پھر دوزخ کے محافظوں اور کارکنوں سے یُوں مخاطب ہوتا ہے۔ "تُمہارا فرض ہے کہ دوزخ کے اُن مکانوں کی حفاظت کرو جہاں شریروں کی رُوح پر رآ دیوتا کے حُکم کے مطابق عذاب کیا جاتا ہے۔"

دوزخ اور اُس کی آتشی جھیل کا کارکن ہورس ہے۔ وُہ ایک عصا ٹیکے ہُوئے اور رُوحوں کو جن کی مُشکیں کسی ہوتی ہیں لے کر دوزخ کی طرف جاتا ہے۔ اُسے پہلے ایک سانپ ملتا ہے جسے کھیتی (Kheti) کہتے ہیں۔ اُس کے مُنہ سے آگ نکلتی رہتی ہے۔ اس سانپ کو دیکھ کر ہورس گُنہگاروں سے کہتا ہے۔ "اے شریرو تُمہاری طاقت زائل ہو جائے گی، اب تُم زندہ نہ رہو گے بلکہ ہلاک کئے جاؤ گے۔ تُم نے میرے باپ اوسائرس کی نافرمانی کی ہے۔" اور سانپ سے یُوں مخاطب ہوتا ہے۔ "میری کھیتی اپنا مُنہ کھول، میرے باپ کے دشمنوں پر آگ برسا، اُن کے جسموں کو جلا دے، اُن کی رُوحوں

کو خاک سیاہ کر دے" یہ سنتے ہی سانپ اُن پر آگ برساتا ہے اور وہ جل بھن کر رہ جاتے ہیں۔

چارلس لینورمانٹ نے قدیم مصریوں کے حالات میں ایک کتاب لکھی ہے۔ اُس میں وہ راسس پنجم کی قبر کی ایک تصویر کا ذکر کرتا ہے جو گنہگاروں کی سزا کے متعلق تھی۔ گنہگار رُوح کبھی تو کُلنگ کی شکل میں نظر آتی ہے اور کبھی باز کی شکل میں جس کا سر آدمی کا سا ہوتا ہے۔ کبھی وہ انسان کی صورت میں نظر آتی ہے اور اُس کے ہاتھ پُشت پر بندھے ہوئے ہیں۔ ایک شخص کے سر میں سے خُون بہ رہا ہے اور ایک شخص جس کا سر قلم کیا گیا تھا، لٹک رہا تھا۔ ایک آدمی کھولتے ہوئے پانی کے کڑھاؤ میں پڑا ہوا ہے اور دُوسرا شخص اپنے دِل کو جو اُس کے سینہ میں سے نکال کر زمین پر پھینک دیا گیا ہے اپنی طرف گھسیٹ رہا ہے۔

خاموس کی دُوسری کہانی میں جسے مسٹر الیف ایل گریفتھ نے ترجمہ کیا دوزخ کی ایک سیر کا حال درج ہے۔ ہورس اپنے باپ کو دوزخ کی سیر کو لے جاتا ہے جہاں وہ دیکھتا ہے کہ مُردوں کے سروں پر دانا پانی لٹکتا رہتا ہے۔ وہ اُسے لینے کو بھاگتے ہیں، مگر اور رُوحیں اُن کے دِل کے نیچے گڑھے کھود کر اُنہیں روک لیتی ہیں۔ دوزخ کے ایک مکان میں ایک شخص نظر آتا ہے جس کی سیدھی آنکھ میں دروازے کی چٹخنی لگی ہوئی ہے۔ وہ زور زور سے آہ و زاری کر رہا ہے۔ عدالت کے ساتویں کمرے میں اوسائرس کے سامنے ایک گنہگار سؤر کے بچے کی شکل میں لایا گیا۔ اُس کی بدیاں اُس کی نیکیوں سے

بہت زیادہ تھیں۔ اُسے اُم مت کے سامنے جس کا سر مگرمچھ، جسم شیر اور پچھلا دھڑ دریائی گھوڑے کا سا تھا ڈال دیا گیا۔ اُس نے اُس گنہگار کو چیر پھاڑ ڈالا اور اُسے کھا لیا اور اُس طرح اُس کا جسم اور اُس کی رُوح ہلاک کر دی گئی۔

تاریخِ مصر کے متعلق جس قدر کتابیں ہم تک پہنچی ہیں اُن میں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ جو لوگ اس دُنیا میں آئے تھے، اُن کو عقبےٰ میں دوبارہ پیدا ہونا پڑا۔ وُہ اب تک زندہ ہیں، اور جب تک دُنیا قائم ہے زندہ رہیں گے۔ مصریوں میں ایک قادرِ مطلق خُدا کی ہستی کا وجُود قدیم زمانے میں پایا جاتا ہے لیکن عقبیٰ یا دُوسری زندگی کا عقیدہ اُن کے ہاں اس سے بھی پُرانا ہے اور اُس کی تاریخ ۱۲۰۰۰ سے ۱۰۰۰۰ قبل مسیح تک قرار دی جاتی ہے اور دُوسری زندگی کے خیال کی تائید غیر تاریخی زمانہ کی قبروں کی اُن چیزوں سے ہوتی ہے جو مُردوں کو نذر کے طور پر چڑھائی جاتی تھیں۔ اس عقیدے سے قیامت اور حیاتِ ابدی کی ابتداء ہُوئی ہے۔

اس امر کے یقین کرنے کی کافی وجُوہ موجُود ہیں کہ غیر تاریخی زمانہ کے مصریوں کا یہ عقیدہ تھا کہ عقبیٰ میں بھی اُنہیں کھانے پینے، عیش کرنے کو اور ایک جسم ملے گا مگر وُہ جسم اس جسم سے مختلف ہوگا جو اُسے دُنیا میں ملا تھا۔ قدیم مصریوں میں یہ دستُور تھا کہ زیادہ تر لوگ نعشوں کو مصالحوں سے محفُوظ کر کے دفن کیا کرتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُن میں یہ عقیدہ پایا جاتا تھا کہ وُہی جسم دُوسری زندگی میں ملے گا۔

مصریوں میں انسان کے مادی جسم کو خات کہتے ہیں جسے وہ مصالحہ لگانے کے بعد دفن کر دیا کرتے تھے تاکہ وہ محفوظ رہے۔ اوسائرس دیوتا کا بھی جسم مادی تھا، اور اس کے مختلف اعضا مندر میں محفوظ رکھے گئے تھے۔ انسان کے جسم سے کا یعنی مضاعف یا ہمزاد بھی تعلق رکھتا ہے۔ اوسائرس کے اعضاء پر اور مصریوں کی قبروں پر اس کا کی پرورش یا زندگی قائم رکھنے کے لئے نذریں کھانے پینے کی چیزیں چڑھائی جاتی تھیں، کیونکہ اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ اگر اُسے یہ چیزیں نہ چڑھائی جائیں تو وہ فاقوں کے مارے مر جائے گا اور انہیں دوسری زندگی نصیب نہ ہو سکے گی۔

قدیم مصریوں کا عقیدہ تھا کہ انسان کی ہستی ان آٹھ چیزوں سے بنتی ہے یعنی جسم، ہمزاد، رُوح، دِل، عقل، طاقت، سایہ اور نام۔ مگر ان میں تہذیب اور شائستگی کو ترقی ہونے سے یہ خیال جاتا رہا اور انسان صرف تین چیزوں سے مرکب سمجھا جانے لگا یعنی جسم، ہمزاد اور رُوح سے اور وہ یہ ماننے لگے کہ فانی جسم عقبیٰ میں زندہ نہیں کیا جائے گا، حالانکہ جاہل مصری فانی جسم کے دوبارہ زندہ ہونے پر جمے رہے۔ لیکن جو لوگ مذہبی کتابوں سے واقف تھے، اُن کے دِلوں سے یہ خیال اُٹھ گیا، یہاں تک کہ سنہ ۳۴۰۰ قبل مسیح کے قریب لوگوں نے یہ تسلیم کر لیا۔ کہ رُوح عالم بالا پر چلی جاتی ہے اور جسم خاک میں مل جاتا ہے۔"

مصریوں کا یہ عقیدہ تھا کہ وہ مرنے کے بعد رآ کی کشتی میں بیٹھ کر آسمان کی سیر کریں گے اور کروڑوں برس زندہ رہیں گے مگر وہ بھی سمجھتے

تھے کہ اس جسم کے ذریعہ سیر اور ایسی طویل زندگی ناممکن ہے۔ پہلے تو اُنھوں نے یہ سمجھا کہ جس طرح آفتاب کا جسم ہر روز زندہ ہو جاتا ہے اسی طرح اُن کے جسم بھی زندہ ہو جائیں گے مگر بعد میں وہ ماننے لگے کہ فانی جسم غیر فانی نہیں ہو سکتا اور جسم کا محفوظ کرنا دوبارہ زندہ ہونے کے لئے کافی نہیں ہے۔

فانی جسم کے دوبارہ زندہ ہونے کا خیال اُن کے دلوں میں اِس لئے سما گیا تھا کہ آئسس نے تھوتھ کی بنائی ہوئی دُعا کے لئے اوسائرس کا جسم زندہ کر لیا تھا۔ اس لئے اُن کے دلوں میں یہ بات جڑ پکڑ گئی تھی کہ اس دُعا کے ذریعے فانی جسم غیر فانی ہو جاتا ہے جو قبر سے نکل کر عالم بالا پر چلا جاتا اور دیوتاؤں کی مجلس میں شریک ہو جاتا ہے اور رُوح اُس میں رہنے لگتی ہے مگر اس بات کو وہ بعد میں غلط سمجھنے لگے۔

غیر تاریخی زمانہ کے مصری قبر پہ کھانے پینے کی چیزیں اس خیال سے چڑھایا کرتے تھے کہ یہ چیزیں مرحوم کو دُوسری دُنیا میں مل جائیں گی۔ اس خیال سے وہ یہ سمجھنے لگے کہ دُوسری دُنیا میں یہ جسم بھی اُن کو دیا جائیگا مگر بعد میں وہ سمجھ گئے کہ دُوسری دُنیا میں رُوح کو دیوتاؤں کی سی رُوحانی غذا کھانے کو ملتی ہے، اس لئے ایسے جسم کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اِن میں یہ خیال رائج تھا کہ مرنے کے بعد رُوح کو ایک مقام پر رہنا ہوتا ہے، جسے سیخت آرو (Sekhet Aaru) کہتے ہیں۔ وہاں اُسے دُنیا کا سا آرام اور چیزیں ملتی ہیں۔

مصریوں کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ دُوسری زندگی میں ہر شخص اپنے رشتہ داروں اور دوستوں میں دُنیا کی سی خانگی زندگی بسر کرے گا اور رفتہ رفتہ دُعاؤں اور التجاؤں کے ذریعے پاک ہوکر دیوتاؤں کی مانند ہوجائیگا۔ وُہ دیوتاؤں کی مجلس میں اور سچی راحت میں حصّہ لے گا اور ابد تک زندہ رہے گا۔

مُردوں کی کتاب

یہ مشہور کتاب مصریوں کی بائبل سمجھو۔ وُہ بہت سی دُعاؤں اور منتروں کا جو مُردوں کے کام آتے ہیں مجموعہ ہے۔ اُن کے ذریعہ مُردے موت کے بعد بہشت میں داخل ہوکر سچی خوشی اور راحت بھری زندگی بسر کر سکتے تھے۔ جو شخص اس کتاب کی دُعاؤں اور منتروں سے ناواقف ہوتا، وُہ مرنے کے بعد جب سفرِ آخرت پر روانہ ہوجاتا تو ہلاک کیا جاتا، لیکن جو شخص اُن سے واقف ہوتا وُہ ہمیشہ کی راحت کا مالک ہوسکتا تھا۔ اگرچہ ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ اس کتاب میں ساتویں صدی ق۔م تک کے حالات درج ہیں، لیکن اس کے بعض بعض حصّے اُن حالات سے مزیّن ہیں جو اُس زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں جسے عہدِ تاریخی کا شروع زمانہ کہتے ہیں۔

جیسا کہ بیان ہوچکا، اہلِ مصر ابتدائی زمانہ سے ہی حیات بعد الممات کے قائل تھے اور وُہ انسان کی ہستی کو ان آٹھ چیزوں یا اعضاء سے

مرکب جانتے تھے۔ جسم، ہمزاد۔ رُوح۔ دل۔ عقل۔ طاقت۔ سایہ اور نام۔ ان میں سے یہ تین زیادہ ضروری مانے جاتے تھے۔ جسم۔ ہمزاد اور رُوح۔ ہمزاد ان کی موت کے بعد اسی دُنیا میں رہ جاتا تھا، اور آزادی کے ساتھ پھرتا تھا۔ اُسے نذریں چڑھائی جاتی تھیں، ورنہ اس کے مرجانے کا احتمال تھا۔ چونکہ جسم اور ہمزاد ایک دوسرے کے تابع اور لازم وملزوم تھے اور ہمزاد موت کے بعد بھی جسم میں سکونت رکھتا تھا، اس خیال سے نعش کو مصالحہ لگا کر سڑنے اور گلنے سے محفوظ کر دیا جاتا تھا، تاکہ ہمزاد اُس میں سکونت کر سکے۔ اور جب موبیائی یعنی مصالحہ لگی ہوئی نعش کسی وجہ سے خراب ہو جاتی تو اس کی جگہ مرنے والے شخص کی کئی کئی مورتیں یا بُت بنا کر رکھے جاتے تھے تاکہ ہمزاد کو تکلیف نہ ہو سکے۔ رہی رُوح وُہ اس زندگی ہی تک جسم میں رہتی اور موت کے بعد عالم ارواح کو چلی جاتی اور وہاں دیوتاؤں کے ساتھ رہتی تھی اور راحت و لُطف کی زندگی بسر کرتی تھی۔

مصر میں کوئی شخص بھی موت سے نہیں مرتا تھا، بلکہ یا تو جادُو سے یا بدارواح سے قتل کیا جاتا تھا۔ اسی باعث ادویہ اور طبابت کا مصر میں زیادہ رواج نہ ہُوا، اور نہ اُسے فروغ حاصل ہو سکا۔ مصر کے طبیب علاج کے متعلق کسی خاص بات کے ماہر ہوتے تھے اور منتروں اور تعویذوں سے بیماروں کا علاج کرتے تھے۔ دواؤں کا استعمال کم کیا جاتا تھا۔ بعض ادویہ دیوتاؤں کی تجویز کردہ مانی جاتی تھیں، لیکن جب دوا اور منتر وغیرہ سے کام لینے پر بھی مریض فوت ہو جاتا تو اُس کی نعش مصالحہ

لگانے والوں کے سپرد کر دی جاتی تھی۔ وہ ۷۰ دن تک اُسے ایک معطّر عرق میں ڈالے رکھتے تھے مگر اس عرق میں ڈالے جانے سے پہلے مُردے کا دماغ اور آنتیں نکال لی جاتی تھیں، اور اُن کو چار گھڑوں میں رکھ کر چار دیوتاؤں کی نگرانی میں رکھ دیا جاتا تھا۔ ۷۰ دن گزرنے پر نعش پر بڑی احتیاط سے باریک ململ یا اسی قسم کے کسی دُوسرے کپڑے کی چار تہیں لپیٹی جاتی تھیں۔ اُن تہوں کے بیچ میں "مُردوں کی کتاب" میں سے بہت سے منتر اور تعویذ نقل کر کے رکھے جاتے تھے۔ جب نعش پر کپڑے کی تہ لپیٹی جاتی تھی تو ایک پُوجاری مُردوں کی کتاب میں سے کچھ پڑھ کر نعش پر دَم کرتا جاتا تھا یا مُردے کے کان میں پھُونکتا جاتا تھا تاکہ نعش پر جن جن باتوں کا عمل کیا جاتا تھا وہ اچھی طرح پُورا ہو جائے۔ جب تک یہ تمام باتیں انجام پاتی تھیں تب تک مُردے کی شکل کا ایک جنازہ بن کر تیار ہو جاتا تھا اور سُنار اُس کے لئے زیوروں کی ایک پوشاک بنا کر دیتے تھے۔ اس کے بعد نعش دفن کر دی جاتی اور نذر کھانے پینے اور آرائش کی چیزیں مُردے کی نعش کے ساتھ ساتھ لے جا کر قبر کے اُوپر چڑھائی جاتی تھیں۔

مصریوں کے خیال کے مُطابق رُوح مَوت کے بعد ایک جگہ رہتی تھی اور ایک حالت میں، اور نذروں وغیرہ سے اُس کی مدد نہ کی جاتی تو وُہ بھی فنا ہو جاتی، یا کوئی عفریت بن جاتی تھی اور اپنے پڑوسیوں اور رشتہ داروں کو تکلیف دیتی تھی۔ مَوت کے بعد اُسے مسرّت کے جاودانی

مُلک کی تلاش کرنی پڑتی تھی، جس میں وُہ اوسائرس کی عدالت میں ہوکر داخل ہوتی تھی۔ رستہ میں اُسے بداروح۔ سانپوں۔ بچھوؤں۔ مگرمچھوں اور بندروں کا جو ارواح کو ستاتی ہیں مقابلہ کرنا پڑتا تھا لیکن جسے مُردوں کی کتاب یاد ہوتی اور اُس کے گنڈے تعویذ کفن میں رکھ دیئے جاتے، اُسے اُن آزاردہ چیزوں سے کوئی تکلیف نہیں پہنچ سکتی تھی۔ منتروں کے پڑھنے اور اُن تعویذوں کے دکھانے ہی سے یہ چیزیں بھاگ جاتی یا فنا ہوجاتی تھیں۔ عدم کے سفر کے بعد اُسے اوسائرس کی بارگاہ کے دروازے پر پہنچ کر ۸۶ نام دُہرانے پڑتے تھے، ورنہ اُس کے لئے دروازہ بند ہوجاتا تھا۔ اسی دروازے پر اُسے رآ اور اوسائرس کی حمد کے گیت گانے پڑتے تھے اور جب وُہ اوسائرس کے بُت کے سامنے حاضر ہوتی تو اُسے اپنے افعال کی جواب دہی کرنی پڑتی تھی۔ ایک میزان میں انوبس اُس کے دِل کو راستبازی یا معات دیوی کے پروں کے مقابلہ میں رکھ کر وزن کرتا تھا اور پھر اُس پر جو فتوے صادر کیا جاتا اُسے تھوتھ دیوتا قلمبند کرتا تھا۔ اُس کے پاس ہی آمت دیوی جو مُردوں کو کھا جاتی تھی بیٹھی رہتی تھی۔ راستباز رُوح کو بہشت میں داخل کر لیا جاتا تھا، مگر بدکار کو طرح طرح کی سزا دی جاتی تھی جس سے اُس کو بہت تکلیف ہوتی تھی مگر جسے وُہ مجبوراً برداشت کرتا تھا۔

زردشتی معتقدات

اوستا کے دفتر یاستا میں لکھا ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی رُوح تین دن تک بیم ورجا کی حالت میں زمین پر رہتی ہے۔ چوتھے دن صبح سویرے سروش (جبریل) رُوح کو اپنے ساتھ ایک پُل پر لے جاتا ہے جس کا نام "کنود" ہے۔ یہ پُل جیسا کہ دبن کرد میں لکھا ہے، دوزخ پر قائم ہے اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ لیکن نیک ارواح کو ایسا معلوم ہوگا کہ جیسے نو تلواریں برابر رکھ دی گئی ہوں۔ پُل پر پہنچ کر رُوح اگر نیک ہے، تو اس کے اعمال ایک نوخیز حسینہ جمیلہ حُور کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ لیکن بدکردار ارواح کے سامنے ایک کالی کلوٹی بھوتنی آتی ہے المختصر سروش فرشتہ کنود پُل کے پاس رُوح کو کھڑا کر دیتا ہے، جہاں انصاف اور سچائی کے فرشتہ راسنہ اور استد فرشتہ مہر کے سامنے اُس کے اعمال کو وزن کرتے ہیں اور وزن کے نتیجہ کے موافق بہشت یا دوزخ میں بھیجتے ہیں۔ لیکن نیکی اور بدی کا پلہ اگر برابر رہا، تو ہمیشگان (اعراف) میں جگہ ملتی ہے۔

ارداویر اپنے سیر سموات کے متعلق لکھتا ہے کہ :-

"میں عالم مکاشفہ میں سروش یزد سے ملا جس نے مجھے کنواد پُل پر ایک سونے کی ترازو دکھائی جس میں مُردوں کے اعمال تولے جاتے تھے۔ میں نے مہر یزد کو پانچہزار فرشتوں کے جھرمٹ میں دیکھا۔

"پھر میں امیس اسپنت (مقرب فرشتہ) ہمن سے ملا جو ایک سونے کے تخت پر جلوہ افروز تھا۔ اُس نے مجھے اُہرمزد کے حضور میں پیش کیا جس کے گرد مقرب فرشتے، زردشت، گشتاسب اور جاماسپ وغیرہم کے فروہر (ارواح) صف باندھے کھڑے تھے۔ میں ادب سے جھکا اور حمد و ثنا میں مصروف ہوا۔ اُہرمزد کے حکم سے سروش نے مجھے بہشت اور دوزخ کی سیر کرائی۔"

یُونانیوں کے مُعتقدات

آرفیئس (Orphens) چھ سو سال قبل از مسیح ایک مشہور فلاسفر گذرا ہے۔ یہ اُس مشہور مذہب کا بانی ہے جو آرفک کہلاتا ہے اور جو یُونانیوں کے دل و دماغ پر صدیوں تک قابض رہا۔ اس مذہب کا اصل الاصول یہ ہے، کہ "خُدا سے مُتحد ہونے کے قابل وہی ہوتا ہے جو الٰہی عنصر کا مالک ہو۔"
(The Idea of Immortality pp. 24 and 25)

اس لئے آرفی مذہب کی رُو سے رُوح ایک الٰہی عنصر ہے جو گناہ کی وجہ سے عالم لاہوت سے علیحدہ ہو گئی ہے اور خود رُوح کو اس کا بخوبی علم ہے۔ چنانچہ رُوح جب اس دُنیاوی دورہ کو ختم کر کے جسم سے علیحدہ ہو جاتی ہے تو (Persephone) کے آگے جا کر یُوں اقرار کرتی ہے کہ "میں اپنے ناکردنی افعال کی سزا پا چکی۔ اب میں قابل تعظیم پرسیفوں کی خدمت میں عرض کرتی ہوں کہ ازراہِ فضل و کرم مجھے متقیوں کے مقام میں جگہ عنایت کریں۔"

Adam--Religious Teachers of Grace P.III

ان کا عقیدہ ہے کہ "رُوح کا جسم میں مقید ہونا اس کی موت ہے۔ رُوح کی حقیقی زندگی اُس وقت شروع ہوتی ہے جب اس فانی جسم سے رہا ہو جاتی ہے۔

(The Idea of Immortality pp. 26—27.

آرفی مذہب کا یہ عقیدہ کہ رُوح ایک الٰہی عنصر ہے اس قدر مقبول ہو چکا تھا کہ Pinder کے قصائد میں بھی اس کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔ چنانچہ اس کے ایک بند کا ترجمہ ازیں قرار ہے کہ:۔

"جب انسان کا بدن مرتا ہے تو صرف اُسی کی رُوح زندہ رہتی ہے کیونکہ صرف رُوح ہی خُدا کے پاس سے آئی تھی۔" (بند ۱۳۱)

حکیم الٰہی سقراط اور اُس کے شاگرد افلاطون بھی اُسی عقیدہ سے متاثر معلوم ہوتے ہیں کہ:۔

"رُوح ہی انسان کی حقیقی ہستی ہے اور رُوح ہی اس کے علم اور روزمرّہ کے افعال میں مشغولِ عمل رہتی ہے۔"

(The Idea of Immortality p. 34)

اس لئے ان کے نزدیک رُوح کی حفاظت اور خبر گیری انسان کا اوّلین فرض ہے۔ چنانچہ سقراط کہتا ہے کہ:۔

"میں زندگی بھر تمہیں باصرار یہی کہتا رہا کہ تمہیں اوّل اور خاص طور پر اپنی رُوح کی تکمیل کے لئے کوشش کرنی چاہیئے اور اس کے بعد اپنے

جسم اور مال و دولت کا ذکر کرنا چاہیئے۔" (Apology)

افلاطون کا آخری پیغام ساری دُنیا کے لئے یہ تھا کہ:-

"انسانوں کے لئے ان تمام چیزوں کی بہ نسبت جو اُس کے قبضہ میں ہیں قابلِ اعتنا چیز خُداؤں کے بعد اُس کی رُوح ہے جو ایک الٰہی عنصر اور حقیقت میں اس کی ہستی ہے.... ہماری دانست میں رُوح اس لائق ہے کہ خُداؤں کے بعد اس کی عزت و احترام کیا جائے۔ ہمیں قانون کا یقین کرنا چاہیئے جو ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ رُوح ہر اعتبار سے جسم سے بہتر ہے، بلکہ رُوح ہی ہے جو ہم کو وہ بناتی جو ہم ہیں۔" (Laws)

بالآخر افلاطون رُوح اور جسم میں یہ لطیف فرق بتلاتا ہے کہ:-

"جب ہم مرتے ہیں تو ہمارا مُردہ بدن ہمارا سایہ بالتصویر کہلاتا ہے کیونکہ ہمارا حقیقی اور غیر فانی حصہ جو رُوح کہلاتا ہے، براہِ راست دُوسرے خُداؤں کے پاس جاتی ہے تاکہ اُن کے آگے اپنے افعال کا حساب کتاب دے۔" (Laws 959)

رُوح کی قدامت اور اُس کے لاہُوتی ہونے کا ایک صریح بیان Phaedrus p. 245 میں ان پر قرار ہے کہ:-

"رُوح غیر فانی ہے، کیونکہ وہ حقیقی ہستی اور جوہر ہے۔ رُوح بذاتہٖ متحرک اور محرک ہے۔ رُوح ہی حرکت کا سرچشمہ اور مبدا ہے جو دوسری اشیاء کو حرکت دیتی ہے۔ ایک چیز جو کسی امرِ خارجی کے اثر سے متحرک

ہو جاتی ہے وہ ذی رُوح نہیں ہو سکتی اور جو چیز کسی امرِ داخلی سے مُتحرک ہو جاتی ہے، وہ ذی رُوح ہے"۔

افلاطُون صرف نفسِ ناطقہ کو لاہُوتی اور غیر فانی سمجھتا ہے، اور باقی اَرواح کو جو بدن کے مختلف حصّوں میں رہتی ہیں، فانی سمجھتا ہے۔ ان کی تقسیم وُہ یُوں کرتا ہے، کہ :-

(۱) نفسِ ناطقہ یا رُوحِ عقلی جو دماغ میں رہتی ہے۔ یہ خُدا کی خاص الخاص غیر فانی نعمت ہے جو صرف اِنسان کو عطا کی گئی ہے۔

(۲) رُوحِ حیوانی جو دِل میں رہتی ہے اور فانی ہے۔

(۳) رُوحِ طبعی جو جسم کے اسفل حِصّہ میں رہتی ہے اور فانی ہے۔

(The Idea of Immortality p. 42)

ارسطُو

ارسطُو کے نزدیک رُوح کی متعدد قسمیں ہیں :-

(۱) رُوحِ نباتی جو پھلوں اور پھُولوں اور درختوں میں پائی جاتی ہے، اس سے صرف بالیدگی نشو و نما اور تناسل کا ظہور ہوتا ہے۔

(۲) رُوحِ حیوانی جو تمام جانداروں میں پائی جاتی ہے، یہ رُوح نباتی کی قُوتوں کے علاوہ ایک اور قُوّت کی بھی مالک ہوتی ہے، یعنی حِسّ و ادراک کی قُوّت اس سے ظہُور میں آتی ہے۔

(۳) اِنسانی رُوح جو رُوحِ نباتی و حیوانی کی قُوّتوں کے علاوہ تعقّل اور تفکر و نظر پر بھی مشتمل ہے، رُوح کا یہ سب سے اعلےٰ درجہ ہے۔

رُوحوں کی یہ ترتیب کچھ اس طرح پر واقع ہُوئی ہے کہ بالائی منازل

کا اس وقت تک ظہور نہیں ہو سکتا، تاوقتیکہ زیریں منازل طے نہ کر لئے جائیں۔ یہی سبب ہے کہ انسان اپنی خاص قوتوں کے علاوہ ان تمام قوتوں کا بھی مالک ہے جو حیوانوں میں پائی جاتی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس حیوانات اپنی خاص قوتوں کے علاوہ نباتات کی قوتوں کے بھی مالک ہیں۔

اگلے یونانی حکماء، مثلاً دیمقراطیس۔ انکساغورس وغیرہ نفسِ ناطقہ اور روح کو ایک ہی سمجھتے تھے۔ افلاطون نے پہلے پہل نفسِ ناطقہ اور روح میں تفریق ثابت کی۔ ارسطو اس تفریق میں تو اپنے استاد سے متفق ہے مگر نفسِ ناطقہ یا روحِ عقلی کے مستقر کو بے معنی سمجھتا ہے، کیونکہ دماغ اس کے نزدیک محض ایک بارد و رطب غیر حساس عضو ہے جس سے نفسِ ناطقہ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ارسطو کے نزدیک نفسِ ناطقہ اور دیگر روحوں میں فرق یہی ہے کہ نفسِ ناطقہ اپنے وجود و فعل میں جسم یا جسم کے کسی حصہ کا نہ محتاج ہے اور نہ جسم اور جسمانی قوتوں پر ان کے فعل و عمل کا انحصار ہے۔

نفسِ ناطقہ کا اصلی مستقر اجرام سماوی میں ہے جو تمام زیریں اشیاء سے اشرف و برتر اور تمام چیزوں کے مدرک ہیں۔ گویا عالمِ سفلی میں نفسِ ناطقہ چند اغراض پورے کرنے کے لئے بھیجا جاتا ہے ورنہ اس عالم کے تشخصات سے اس کو علاقہ نہیں۔ نفسِ ناطقہ کا وظیفہ و عمل محض کلیات و صور کا ادراک کرنا ہے۔ انسان کا نفسِ ناطقہ محض یہی غرض پوری کرنے کے لئے عطا کیا گیا ہے، یعنی اس لئے کہ انسان حسیات کی دنیا سے نکل کر معقولات کے ادراک کی قابلیت اپنے میں پیدا کرے۔ (The anima)

مَیں نے حکیم الٰہی سقراط کے عقیدہ کے متعلق سطورِ بالا میں ضمناً کچھ لکھا ہے۔ ذیل میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ اُن کے شاگردِ رشید افلاطون کے مقالات سے ایک اقتباس درج کرتا ہوں۔

سقراط کی موت کا منظر افلاطون کے قلم سے

سقراط کے شاگرد کرائیٹو اور سمیاس قیدخانہ میں آتے ہیں، سقراط اپنے بستر پر بیٹھ جاتا ہے۔ بیڑیاں کاٹ دی گئی ہیں۔

سقراط اپنے پاؤں کو سہلا کر کہتا ہے:۔

سقراط:۔ میرے دوستو! جسے لوگ راحت کہتے ہیں وہ ایک عجیب معمّہ ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ وہ اپنی ضدِ حقیقی تکلیف کے ساتھ کس طرح شریک ہے، حالانکہ دونو ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔ لیکن اگر ایک ان میں سے کسی کو ملتی ہے تو خواہ مخواہ دوسرے سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔ گویا دونو کے سرے جڑے ہوئے ہیں۔ اگر الیسف اس پر غور کرتا تو ان کا افسانہ یوں بناتا کہ دیوتا کو جب ان دو جنگجو شکلوں میں صلح کرانا منظور ہوا تو اس نے دونوں کے سر ایک ہی زنجیر میں جوڑ دئے۔ اب اگر ایک سر کھینچو تو دوسرا بھی لامحالہ کھنچ آئیگا۔ دیکھو میرے پاؤں میں بیڑیوں کے سبب سے درد تھا۔ اب بیڑیاں کٹ گئی ہیں تو تکلیف کی جگہ راحت نے لے لی ہے۔ جب تک یہ جسم سنگِ راہ ہے اور روح آلودۂ علائق اس وقت تک شاہدِ حق کا ملنا دشوار ہے۔ اس لئے حکمت کا مقتضا یہ ہے کہ حتی الوسع تعلقاتِ جسم سے علیحدہ رہے تاکہ روح میں صفائی پیدا ہو اور جسم سے جدا ہو کر جمعیت حاصل کرلے۔ موت کیا ہے؟ روح کا

قیدِ جسم سے آزاد ہو جانا۔ اس لئے حکمت کا سچا طالب وُہ ہے جو ایسی آزادی کا متمنی ہے۔ کیوں کیا ایسا نہیں ؟

شاگرد :۔ بیشک ایسا ہی ہے۔

سقراط :۔ اگر ایسا ہے تو کیا شرم کی بات نہیں ہے کہ جو شخص تمام عُمر موت کا طالب رہا ہو، اُس کے سامنے جس وقت موت آئے تو وُہ جزع و فزع میں مبتلا ہو جائے ؟

شاگرد :۔ کیوں نہیں ؟

سقراط :۔ سمیاس، حقیقت میں جو لوگ جویائے حکمت ہیں، وُہ دراصل موت کے طالب ہیں اور اُن کے سامنے موت کوئی خوفناک شئے نہیں ہے۔ کیونکہ جس شئے سے وُہ کارہ تھے، یعنی جسم اُس سے نجات ملی اور اب وُہ آزادی کے ساتھ اپنے مطلوب کی طرف جاتے ہیں۔ پُرانی داستانوں میں لکھا ہے کہ بہت سے اگلے لوگ غیر مرئی عالم میں بخوشی خاطر چلے گئے تاکہ وہاں وُہ اپنے عیال و اطفال سے ملیں۔ اب اگر طالبِ حکمت اس غرض سے غیر مرئی عالم میں جائے کہ وُہ وہاں آزادی سے اپنے مطلوب سے ہمکنار ہو تو کیا بعید ہے۔ اس کا تو دین و ایمان ہی یہی ہے۔ میرے دوستو اگر وُہ سچا شیدائے حکمت ہے، تو موت سے ڈرنا کیا معنی وُہ تو اور خوش ہوگا۔

شاگرد :۔ ہونا تو ایسا ہی چاہیئے۔

سقراط :۔ میرے دوستو اس امر پر غور کرو کہ اگر رُوح کو فنا نہیں تو ایک اور بڑا اہم معاملہ پیش آتا ہے جس کا تعلق محض اس زندگی سے نہیں بلکہ ہمیشہ کے

واسطے ہے وہ کیا ہے سنو اگر موت کے یہ معنی ہیں کہ انسان کا قصہ ہی تمام ہو گیا تو بدکار بڑے مزے میں رہے، کیونکہ مرنے کے بعد جسم کی طرح روح اور اس کے افعال بھی فنا ہو گئے اور کچھ جھگڑا ہی باقی نہ رہا۔ لیکن اگر روح کو فنا نہیں ہے تو معاملہ نازک ہے۔ اب اگر گناہوں سے پناہ چاہتے ہو تو حتی الوسع خیر اور حکمت کے راستہ پر چلو کیونکہ روح نے اس دنیا میں جو کچھ اکتساب کیا ہے خیر ہو یا شر اس کے ساتھ غیر مرئی عالم میں جاتا ہے۔ ارواح جب پہلی منزل پر پہنچتی ہیں تو سب سے پہلے ان کے اعمال کا حساب ہوتا ہے۔ اب جن کے اعمال نیک و بد کا پلہ برابر رہا تو وہ ایک دریا میں پھینک دئے جاتے ہیں، جہاں ان پر عذاب ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ گناہوں سے پاک ہو جائیں اور نجات حاصل کریں۔ لیکن جن کے گناہ نہایت سخت ہیں، مثلاً قتل عمد وغیرہ وہ لوگ ٹارٹارس (دوزخ) شیاطین میں پھینک دئے جاتے ہیں، جہاں سے نجات کی کوئی صورت نہیں۔ البتہ ایسے گناہِ کبیرہ کے مرتکب مثلاً والدین کی نافرمانی وغیرہ کے واسطے یہ امید ہے کہ ایک سال کے بعد موجِ دریا ان کو ساحل پر پھینک دے۔ اب اگر انہوں نے عذر معذرت کر کے اپنے مدعیوں کو رضامند کر لیا تو عذاب سے نجات پا جاتے ہیں، ورنہ پھر ٹارٹارس میں پھینک دئے جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے، جب تک حق العباد ادا نہ ہو جائے۔ اب ان لوگوں کا حال سنو جنہوں نے راہِ حق اختیار کی۔ وہ اس دنیا سے یوں جاتے ہیں، جیسے قیدی قید خانہ سے چھوٹے وہ

جسم اور جسمانیت سے منزّہ ہو کر اور علم و حکمت سے باطن حاصل کر کے
ابد الاباد تک آرام کرتے ہیں۔

کرائٹو :۔ بیشک ایسا ہی ہوگا۔ لیکن اے اُستاد اب مجھے اور میرے ساتھیوں کو
کیا حکم ہوتا ہے۔ کچھ اپنی اولاد کے واسطے وصیّت کیجئے یا کسی اور معاملہ میں
تاکہ ہم اس کو بجا لائیں۔

سقراط :۔ میں جو ہمیشہ کہتا رہا اب بھی کہتا ہوں کہ اپنی اپنی آپ فکر کرنا اور میرے
نقشِ قدم پر چلتے رہنا ہی میری خوشنودی کا باعث ہے۔

شاگرد :۔ ہم ایسا ہی کریں گے اور اب فرمایئے کہ آپ کی تجہیز و تکفین کس طرح ہو؟

سقراط :۔ تم جس طرح پسند کرو بشرطیکہ تم مجھے پکڑ سکو اور میں بھاگ نہ جاؤں
(مسکرا کر اور شاگردوں کو محبت بھری نگاہ سے دیکھ کر)
میرے دوستو میں کرائٹو کو کیونکر سمجھاؤں کہ میں وہی سقراط ہوں جو اس وقت
تم سے گفتگو کر رہا ہے وہ تو یہ سمجھ رہا ہے کہ تھوڑی دیر میں میرا جسم مُردہ
اس کے سامنے ہوگا اور اس لئے دریافت کرتا ہے کہ تجہیز و تکفین کیونکر
ہو۔ میرے شاگردو عدالت کے سامنے کرائٹو نے میری ضمانت کی تھی کہ
میں کہیں بھاگ نہ جاؤں گا۔ اس لئے اب تم سے کہتا ہوں کہ اس کے برعکس
تم اس وقت یہ ضمانت کرو کہ میں مرنے کے بعد پھر یہاں ٹھہرنے کا نہیں
بلکہ دوسرے مقام پر چلا جاؤں گا تاکہ کرائٹو میری جدائی کا متحمل ہو سکے اور
جب وہ میرے جسم کو آگ میں جلتا ہوا یا زمین میں دفن ہوتا دیکھے تو میرے
واسطے غمگین نہ ہو کیونکہ موت سے میں کسی مصیبت میں مبتلا نہیں ہوا) اور

نہ اس طرح نوحہ کرے کہ آہ سقراط جل کر راکھ ہوگیا یا خاک میں مل گیا۔"

ماخوذ از مکالمۂ افلاطون موسوم بہ فیڈو

ہنود کے معتقدات

ہنود کی سب سے قدیم مقدس کتابیں وید ہیں۔ رگ وید میں لکھا ہے کہ یم مُردوں کا راجہ ہے جس کا باپ دوستوت (آسمان) اور ماں سرینو (صبح) ہے ذیل میں ہم ایک بھجن کا ترجمہ درج کرتے ہیں جس میں معاد کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ یہ بھجن سوم دیوتا[1] کی شان میں ہے۔

مجھے وہاں لے چل جہاں یم کا راج ہے۔ جہاں بہشت کے دروازے ہیں اور جہاں بڑے بڑے دریا بہتے ہیں۔ مجھے وہاں لے چل اور بقائے دوام عطا کر۔ اے سوم اندر دیوتا کے واسطے رواں ہو۔

مجھے وہاں لے چل جہاں تیسری بہشت ہے۔ جہاں اس آسمان کے اوپر تیسرا عالم نور ہے اور جہاں اپنی مرضی کے موافق انسان سیر کرسکتا ہے۔ وہاں مجھے لے چل اور بقائے دوام عطا کر اے سوم ..... الخ۔

مجھے وہاں لے چل جہاں ہر ایک کی خواہش پوری ہوتی ہے۔ جہاں پر یم کا مقام ہے جہاں کھانا پینا اور چین ہے۔ مجھے وہاں لے چل ..... الخ

مجھے وہاں لے چل جہاں تعیش، مسرت اور سرور ہے۔ جہاں قلب مضطرب کی ہر ایک تمنا بر آتی ہے۔ مجھے وہاں لے چل اور بقائے دوام ... الخ (منڈل یازدہم ۱۱۳)

---

[1] سوم ایک درخت کا عرق ہے جس کے پینے سے نشہ ہوجاتا ہے۔

یہ عقیدہ ہندوستان کے قدیم رشیوں کا ہے لیکن رفتہ رفتہ جب وید کی سیدھی سادھی تعلیم پر فلسفیانہ نکتہ سنجیوں کا رنگ چڑھ گیا تو آواگون (تناسخ) کا عقیدہ جس کا رگ وید میں کہیں ذکر نہیں[1] عام طور سے پھیل گیا۔ یہ عقیدہ اپنشد میں نہایت آب و تاب سے بیان کیا گیا ہے۔ ذیل میں ہم چند مقامات کا ترجمہ درج کرتے ہیں۔

(۱) راجہ چترا گنگا ینی اوالکا اور اس کے بیٹے سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:-

مُردوں کی رُوحیں چندرما دیوتا (چاند) میں پہنچتی ہیں، جہاں سے یہ دیوتا پھر اُنہیں واپس کرتا ہے۔ اب جیسے جس کے اعمال ہیں اُسی کے مطابق کیڑا مکوڑا یا مچھلی یا چڑیا یا شیر یا سؤر یا سانپ یا چیتا یا آدمی یا کچھ اور شکل میں مسخ ہو جاتا ہے۔

پاک ارواح پہلے اگنی کے عالم میں پھر وایو پھر ورونا پراجپتی پھر برہما کے عالموں میں پہنچتی ہیں۔ اس عالم میں حوض آرا۔ کوہ ییشتہا۔ دریائے وجایا شجر الیا۔ شہر سالجیا، ایوان اپراجیا موجود ہیں۔ اندر اور پراجپتی دیوتا محافظ ہیں اور برہمان تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہیں، جن کے حضور میں ارواح حاضر ہوتی ہیں۔ (باب اوّل کوشتاکی)۔

(۲) راجہ جے بلی۔ اسی اُدالکا کے بیٹے سے کہتا ہے:-

مُردوں کی رُوحیں چاند میں رہتی ہیں۔ پھر وہاں سے واپس ہوتی ہیں اور قطرۂ باراں بن کر برستی ہیں، پھر چاول یا کوئی اور غلّہ یا جھاڑی یا درخت

---

[1] دیکھو مسٹر آر سی۔ دت کی کتاب "ہندوستان قدیم"

یا کوئی اور قسم کا تخم بن جاتی ہیں۔ اس درجہ پر پہنچ کر جن جن رُوحوں کے اعمال نیک تھے، وُہ تو برہمن یا چھتری یا ویش کے گھر میں غذا کے ذریعہ سے دُوسرا جنم لیتے ہیں لیکن جن کے اعمال بُرے تھے، وُہ کُتّے یا سُور یا چنڈال کا جنم لیتے ہیں۔ (چند وگیا باب پنجم ۱۰)

۳۔ تناسخ کو صُوفیانہ رنگ میں اس طرح بیان کرتے ہیں، برھادارنیکا باب چہارم (۴) میں لکھا ہے کہ :۔

جس طرح ایک سُنار سونے کے ٹکڑے کو ڈھال کر ایک عُمدہ شکل کا زیور بنا دیتا ہے، اسی طرح رُوح اس جسم کو چھوڑ کر اور جہالت کی آلائش سے پاک ہو کر ایک دُوسرے عُمدہ قالب میں جنم لیتی ہے۔ یہ تو اُس شخص کا حال ہے، جس میں خودی باقی ہے۔ لیکن جب خودی دُور ہو گئی اور صفائی کامل حاصل ہو گئی تو اس کی رُوح کو کسی دُوسرے قالب کے بدلنے کی ضرورت نہیں۔ وُہ سیدھا برہمان میں مل جاتا ہے اور جس طرح سانپ کی کینچل بل میں اُتری پڑی رہتی ہے، اسی طرح جسم بھی علیحدہ ہو جاتا ہے لیکن وُہ غیر مادّی اور غیر فانی رُوح برہمان ہے اور محض نُور ہے۔

جس کو یہ علم حاصل ہو گیا اور نفس پر قابُو پا گیا، وُہ اپنی ہستی کو ہستی مطلق میں دیکھتا ہے۔ جہاں من اور تُو کی گنجائش نہیں ہے۔ اب بدی کا اس پر زور نہیں چلتا۔ بدی پر اس کو فتح حاصل ہو گئی۔ بدی اس کو جلا نہیں سکتی۔ وُہ خود بدی کو جلا دیتا ہے۔ بدی سے نجات پا کر بے داغ اور شک سے پاک ہو کر وُہ سچا برہمان ہو جاتا ہے۔

انتباہ:- عام خیال ہے کہ ہنود میں فلسفہ سانکھیا کا مُوجد کپلا اور مذہب بُودھ کا بانی گوتم وجودِ رُوح کے منکر ہیں، اور اس لئے معاد کے بھی قائل نہیں ہیں لیکن یہ غلط فہمی ہے۔ ذیل میں ہم کپلا کی تعلیم کا ملخص سانکھیا کریکا سے اخذ کر کے درج کرتے ہیں۔

آتما یعنی رُوح کپلا جو سنِ عیسوی سے سات آٹھ سو برس قبل یعنی گوتم بُودھ سے ایک یا دو صدی پیشتر گذرا ہے مادہ اور رُوح دونوں کو قدیم اور ازلی مانتا ہے۔ مادہ یعنی پراکرتی سبب الاسباب ہے جس سے عقل، ادراک اور حواس ظاہر و باطن اور تمام محسوسات کا عالم وجود میں آیا۔ رُوح یعنی آتما مجرد عن المادہ ہے۔ مگر فعل اور انفعال سے بالکلیہ بری ہے۔ لیکن چونکہ دُنیا میں پراکرتی (مادہ) کے ساتھ مقیم ہے، اس لئے انسان کے مرنے کے بعد جب اس جسمِ خاکی سے علیحدہ ہو گئی تو اپنے ہمراہ ایک دُوسرا لطیف جسم لنگا سریر جو اعمال خیر یا شر کا مظہر ہے لے جاتی ہے۔ اب اگر نیکی کا عنصر غالب ہے تو لنگا سریر آٹھ علوی عالم میں جن کی صفت ستو (نُور) ہے، درجہ بدرجہ صعود کرتا رہتا ہے لیکن اگر بدی کا عنصر غالب ہے تو بطور تنزّل پانچ سفلی عالم میں جن کی صفت تمس (ظلمت) ہے، مُبتلائے ہبوط ہو جاتا ہے۔ پانچ سفلی عالم یہ ہیں۔ جانورانِ اہلی۔ جانورانِ صحرائی۔ طیور۔ حشرات الارض وغیرہ۔ نباتات اور جمادات اس طور سے پراکرتی پہلے جسمِ خاکی پھر لنگا سریر کے کرشموں کا تماشا دکھاتے دکھاتے آخر تھک جاتا ہے۔ آتما (رُوح) پر جب رقص

ہستی کی پوری حقیقت روشن ہو گئی تو پراکرتی (مادہ) کی رفاقت سے نجات حاصل ہوجاتی ہے۔ بالفاظ دیگر نجات کامل کا انحصار علم حقیقی پر ہے۔

(سانکھ کاریکا مترجمہ مسٹر ڈیوس ۵۹ لغایت ۱۸)

مذہب بدھ کا زوال

سن عیسوی سے چھ سو برس پیشتر ہندوستان میں عقلائے ہند کا مذہب محض رسم و رواج کا مجموعہ رہ گیا تھا۔ برہمنوں کے مذہبی استبداد کے سامنے قدیم رشیوں کی روحانی تعلیمات سلب ہو گئی تھیں اور اپنشد کی فلسفیانہ نکتہ سنجیاں محض لفظی نزاع اور سخن پروری کے وقف ہو گئیں۔ ۳۳ کروڑ دیوتاؤں کی پرستش اور روحوں کے آواگون کے چکر نے دماغوں کو مختل کر دیا تھا۔ چار ذاتوں کا وجود اگرچہ تقسیم عمل کے رو سے مادی ترقی کو مفید ہوا، لیکن ساتھ ہی اخلاقی اور روحانی موت کا ایک خوفناک آلہ ثابت ہوا اور ملک کی آبادی کا بہت بڑا حصہ شودر کے ذلیل نام سے منسوب ہو کر نجات سے محروم کر دیا گیا۔ ایسی جہالت کے زمانہ میں سرزمین ہند کا لقمان یعنی گوتم بدھ نے ادنے اور اعلے سب پر سچی دینی تعلیم کے ذریعہ سے نجات ابدی کا دروازہ کھول دیا۔ گوتم کی تعلیم کا ملخص یہ ہے کہ حیات مایۂ آلام ہے اور تمنائے حیات جس کی بنا لذائذ جسمانی پر ہے، مصائب کا پیش خیمہ ہے۔ اس لئے اس تمنا کا خون ہوجانا دراصل مصائب کا خاتمہ کر دینا ہے۔ لیکن یہ طریق سخت دشوار ہے اس لئے انسان کو چاہیئے کہ اعمال ہشتگانہ کے ذریعے سے اس منزل کو طے کرے۔ وہ اعمال یہ ہیں۔

درستی ایمان	خلوص نیت	حق گوئی	راست روی
اکلِ حلال	صدق طلب	تصفیہ باطن	استغراق باطن

(مہاوگا باب اوّل ۶)

ان اعمال کی ممارست اور حقیقتِ حیات پر غور و تعمق سے قلب میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کو نروان کہتے ہیں۔ گوتم اس کی تشریح یوں کرتا ہے۔

"جنہوں نے راہِ سلوک طے کر لی اُن کی مصیبت کا خاتمہ ہو گیا۔ غم و الم سے چھوٹ گئے اور ہر قسم کی بیڑیاں کٹ گئیں۔ وہ جمعیتِ خاطر کے ساتھ دُنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔ قیدِ حیات اُن کے واسطے سوہانِ رُوح تھی۔ وہ علائق سے یوں جُدا ہوتی ہیں جیسے راج ہنس جھیل سے اُڑ جاتے ہیں۔ (دھم پد ۹۰ و ۹۱)۔"

بُدھ کے عقیدہ میں نروان اس زندگی میں حاصل ہو سکتا ہے۔ یہی انسان کا منتہائے کمال ہے اور یہی اس کی بہشت ہے۔ ایسا نفس جو فنا کے درجہ پر پہنچ گیا پھر کبھی آواگون کے پھندے میں نہیں پھنس سکتا۔ گوتم کا یہ نروان اُن لوگوں کو جو دیوتاؤں کی شاہد بازیاں اور جسمانی لذات کے افسانے مزے لے لے کر سُنتے تھے، کچھ زائد دلفریب نہ معلوم ہوا۔ اِس لئے اُنہوں نے گوتم سے بار بار پوچھنا شروع کیا کہ دُنیا میں جن لوگوں کو یہ مرتبہ حاصل ہو گیا اُن کی کیفیت مرنے کے بعد کیا ہو گی۔ گوتم نے جو جواب اُن سائلوں کو دیا وہ سُننے کے قابل ہے۔ کہتا ہے:۔

مکالمہ گوتم و ملوکیاپت

ملوکیاپت :۔ مہاتما مجھے صاف صاف بتا دے کہ "بُودھ کامل" مرنے کے بعد زندہ رہتا ہے یا نہیں۔

گوتم :۔ اے شخص کیا میں نے تجھ سے کہا تھا کہ تُو میرا چیلہ بن جا اور میں تجھ سے فنا اور بقائے عالم کا راز کہہ دُوں گا ؟

ملوکیاپت :۔ ایسا تو نہیں ہے۔

گوتم ۔ پھر تُو مجھ سے ایسا سوال نہ کر، لیکن یہ یاد رکھ کہ اگر کوئی شخص زہر آلود تیر سے زخمی ہو جائے اور وُہ طبیب سے یُوں کہے کہ علاجِ زخم سے پہلے مجھے یہ بتا دے کہ مجھے کس نے زخمی کیا تھا آیا وُہ برہمن تھا یا چھتری یا ویش یا شُودر۔ اِنصاف سے بتا کہ ایسے شخص کا کیا انجام ہوگا ؟ بیشک وُہ ایسے تلک زخم سے مر جائے گا۔ بس یہی حال اُس آدمی کا ہے جو نفس کا تزکیہ اس وجہ سے نہیں چاہتا کہ اُس کو معلوم نہیں کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا ؟ اس لئے اے شخص جس مسئلہ میں سکوت اختیار کروں اُس کے متعلق چُون وچرا نہ کرنا۔ لیکن جو کچھ میں نے تعلیم دی ہے اُس کی مُنادی کرتے رہنا۔

گوتم کی مشہور مُریدہ کھیما کا لطیفہ

کوسل کا راجہ ایک سفر میں کھیما سے ملا اور کہنے لگا :۔

رُوح ایک جوہر ہے جو بذاتِ خُود قائم ہے

Pringle Pattison, صاحب اپنی شہرۂ آفاق کتاب The Idea of Immortality میں لکھتے ہیں کہ ہم کہتے ہیں کہ رُوح بذاتِ خُود قائم ہے، اور جسم پر اس کا انحصار نہیں ہے۔ اگرچہ وُہ جسم کے ساتھ رشتہ و تعلق رکھتی ہے، اس میں اور دیگر صفات میں ہم تمیز کرتے ہیں، کیونکہ صفات کسی جوہر کے ساتھ قائم رہتی ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ رُوح ایک غیر مادی جوہر ہے، تو ہمارا یہ مطلب ہوتا ہے کہ ذہنی حقائق جسم کی صفات اور حرکات سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھتی ہیں۔ ص ۴۷، ۲۔

یُونانی حُکماء

یُونانی حُکماء نے بھی تقریباً رُوح کی یہی تعریف کی ہے، جس کو ہم اوراقِ گذشتہ میں بالاجمال لکھ چکے ہیں۔ لہٰذا ان کے دوبارہ نقل کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔

عرب کے حُکمائ کے آراء

قبل اس کے کہ ہم عرب کے ذی شُہرت حُکمائ کے آراء اور خیالات ہدیۂ ناظرین کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف سے اس امر کا سراغ لگائیں کہ رُوح کی حقیقت کیا ہے۔ قرآن شریف میں ایک واقعہ کا ذکر ہے کہ چند اشخاص نے آکر آنحضرت سے رُوح کے متعلق سوال کیا؟ بعض مفسر لکھتے ہیں کہ یہ اشخاص یہُودی تھے اور بعض لکھتے ہیں کہ غیر یہُودی تھے۔ (واللہ اعلم بالصواب) کہ رُوح کیا چیز ہے؟ قرآن شریف کے الفاظ یہ ہیں۔ ویسئلونك عن

الروح . قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلاً
یعنی "اے حضرت (محمدؐ) لوگ آپ سے رُوح کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ آپ ان سے کہہ دیں کہ رُوح میرے ربّ کے (عالم) امر میں سے ہے۔ اور تم میں سے بہت سے کم لوگوں کو اس کا علم دیا گیا ہے۔"¹

اس آیت میں لفظ "امر" تشریح طلب ہے، کیونکہ قرآن شریف میں لفظ "امر" بہت سے معنوں میں استعمال ہُوا ہے۔ لیکن یہاں جس معنی میں استعمال ہُوا ہے، اس آیت میں اس کی توضیح ہے کہ الا له الخلق والامر یعنی "اچھی طرح ہوشیار ہو جاؤ کہ عالم خلق اور عالم امر دونوں خُدا کی ملکیّت (مخلوق) ہیں۔" تمام مستند مفسّرین "عالم خلق" اور "عالم امر کی تفسیر یُوں کرتے ہیں کہ:۔

عالم خلق - وعالم الخلق عبارة عن كل ما يقع عليه مساحة و تقدير و يكون متشخصا بهوتيه محدود مخصوصة وهو الاجسام وعوارضها یعنی "عالم خلق عبارت ہے، ان تمام چیزوں سے جو قابلِ مساحت و اندازہ ہوں اور ایک خاص محدُود ہویت کے ساتھ متشخص ہوں اور اُن صفات سے متصف اجسام ہوتے ہیں۔"

عالم امر | عالم امر کی تفسیر یُوں کرتے ہیں کہ وعالم الامر عبادت عن الموجودات الخارجية عن الحس والجهة و المكان والتميز ولا يدخل تحت المساحة والتقدير لا نتقام

¹ اس جملہ کا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "تم کو اس کا علم بہت کم دیا گیا ہے۔" (منہ)

الکیمیئۃ عنہ یعنی "عالمِ امر عبارت ہے اس موجودات سے جو حس اور جہت اور مکان سے تمیز سے باہر ہیں۔ یہ مساحت اور تقدیر کے ماتحت نہیں ہے کیونکہ اس میں کمیت (مقدار) نہیں ہوتی" (باب الفتوح لمعرفۃ احوال الروح ص ۱۹،۱۸)

غرضیکہ قرآن شریف کی رُو سے بھی رُوح غیر مادی اور مخلوق ہے۔

مُسلمان حکماء اور رُوح

مسلمان حکماء اور ماہرین علم النفس نے رُوح کے متعلق نہایت سیر حاصل بحث کی ہے، اور وُہ بڑی بڑی کتابیں اس پر لکھ چکے ہیں۔ اس بحث میں ہم صرف ابن سینا امام غزالی۔ امام فخرالدین رازی۔ شیخ الاسلام ابن قیم الجوزی اور مصنف حیات النفوس کے افادات میں سے بطور قطرہ از دریا چند اقتباسات ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:۔

امام غزالی

امام غزالی علیہ الرحمۃ "رُوح" کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔ "جان لو کہ رُوح جسم نہیں ہے کہ بدن میں اس کا حلول ایسے ہُوا ہو جیسے برتن میں پانی۔ اور نہ رُوح عرض ہے کہ وُہ دِل و دماغ میں اس طرح حلول کر سکے جس طرح سیاہی سیاہ میں یا علم عالم میں۔ بلکہ وُہ جوہر ہے نہ عرض، کیونکہ رُوح اپنے نفس کا اور اپنے خالق کا اور معقولات کا ادراک کرتی ہے۔ یہ سب علوم ہیں اور علوم عرض ہیں اور قیام عرض بالعرض غیر معقول ہے۔ رُوح جسم نہیں ہے، اس لئے کہ جسم کی تقسیم ہو سکتی ہے اور رُوح کی نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر رُوح کی تقسیم ہو سکے تو جائز ہے کہ اس کے ایک

جزو میں کسی شے کا علم ہو اور دوسرے جزو میں اس کا علم نہ ہو۔ اس صورت میں گویا آنِ واحد میں روح ایک چیز کی عالم بھی ہے اور جاہل بھی۔ تمام عقلاء کے نزدیک روح ایک جزو لایتجزیٰ ہے، یعنی اس کی تقسیم نہیں ہو سکتی۔ لفظ جزو ایک آلہ ہے جو کل کی طرف مضاف ہے، حالانکہ روح کے متعلق جزو اور کل کا اطلاق نہیں ہو سکتا ... پس روح اگر غیر منقسم ہے تو اس کی دو حالتیں ہیں۔ (۱) متمیز ہے (۲) یا متمیز نہیں ہے۔ امر اوّل باطل ہے، کیونکہ ہر متمیز منقسم ہوتا ہے اور متمیز کا منقسم نہ ہونا دلائل عقلی اور نقلی کی رو سے باطل ہے۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ روح غیر منقسم ہے لہٰذا وہ قائم بنفسہٖ ہے اور بالکل غیر متمیز ہے۔" باب الفتوح المعرفۃ احوال الروح ص ۳۱/۳۲

نفسِ ناطقہ۔ روح قلب اور عقل

آگے چل کر امام صاحب نفسِ ناطقہ۔ روح قلب (دل) اور عقل میں فرق بتلاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

یہ چار الفاظ ایسے ہیں جن کو علماء ہمیشہ استعمال کرتے رہتے ہیں، لیکن بہت کم ایسے عالم ہیں جو ان کے معانی اور مسمیات کی حدود پر حاوی ہوں۔ اور اکثر عالم ان کے مسمیاتِ مختلفہ میں مشترک ہونے سے ناواقف ہیں۔ لہٰذا ہم ان کے ان معنوں کی تشریح کرتے ہیں، جو اس بحث کے متعلق ہیں:-

(۱) لفظ قلب (دل) اس کا اطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے۔ اوّل،

اس گوشت کے ٹکڑے پر جو سینہ کے اندر بائیں پسلیوں کے نیچے ہوتا ہے۔ جس کے جوف میں سیاہ رنگ کا خون ہوتا ہے جس سے روح حیوانی پیدا ہوتی ہے۔ جس سے اطباء بحث کیا کرتے ہیں۔ ہمیں اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

دوم، اس لطیفۂ ربانی پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جس کا تعلق قلب جسمانی کے ساتھ رہتا ہے۔ یہی لطیفۂ ربانی تمام معارف کا ادراک کرتا ہے حقیقت میں یہی انسان مطالب و مخاطب و ثواب و معاقب ہے۔

(۲) لفظ روح۔ اس کا بھی دو معنوں میں اطلاق ہوتا ہے۔ اول اس جسم لطیف پر جو جوف قلب جسمانی میں پیدا ہوتا ہے، اور بواسطہ عروق و شرائین تمام جسم میں پھیل کر زندگی پہنچاتا ہے۔ اطباء کے نزدیک یہی روح ہے جو حرارت قلب سے پیدا ہوتی ہے اور اس سے ہمیں کوئی بحث نہیں۔

دوم، اس کا اطلاق اس لطیفۂ عالمہ یعنی روح پر ہوتا ہے جس کی تشریح ہم لفظ قلب میں کر چکے ہیں۔ قرآن کی اس آیت میں کہ "یسئلونک عن الروح" لفظ روح سے یہی لطیفہ عالمہ مراد ہے۔

(۳) لفظ نفس یہ بھی چند معنوں میں مشترک ہے لیکن ہم یہاں اس کے دو معنوں سے بحث کریں گے۔ اول اس کا اطلاق اس قوت پر ہوتا ہے جو قوت غضبی اور شہوانی کا منبع ہے۔ صوفیوں کے نزدیک جہاد النفس سے مراد یہی نفس ہے۔ دوم اس کا اطلاق نفس ناطقہ پر ہوتا ہے، جس کی تشریح ہم قلب اور روح میں کر چکے ہیں۔

(۴) لفظ عقل۔ اس کا بھی بہت سے معنوں پر اطلاق ہوتا ہے لیکن

ہم اس کے دو معنوں کی تشریح کریں گے۔ اوّل۔ اس کا اطلاق العلم بحقائق امور پر ہوتا ہے یعنی اُس علم پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جس سے چیزوں کے حقائق دریافت ہوتے ہیں۔ دوم۔ اس کا اطلاق مدرک العلوم پر ہے یعنی اسی لطیفہ ربانی پر جس کی نسبت ہم لکھ چکے ہیں۔

اب غور کرو کہ الفاظ چار ہیں اور معنی پانچ ہیں یعنی پانچویں معنی وہی لطیفہ عالمہ مدرکہ ہے۔" (احیاء باب عجائب القلب)

امام صاحب کی تشریح بالا پر اگر غور کرو تو معلوم ہو جائے گا کہ بائبل مقدس کے ساتھ کس قدر مطابق ہے۔ چنانچہ اس سے قبل ہم نے اس قسم کی چند آیات نقل کی ہیں۔

امام رازی اور روح

امام صاحب اس آیت کی تفسیر میں کہ:۔ ویسئلونک عن الروح .... الخ۔ لفظ روح کے ہر پہلو پر نہایت شرح وبسط کے ساتھ بحث کی ہے اور کوئی امر ایسا نہیں رہا جو تشنۂ توضیح ہو۔ ہم ذیل میں صرف انہیں دلائل ونکات ورموز کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین کریں گے، جن کا تعلق براہِ راست روح کے فلسفہ کے ساتھ ہے، اور باقی امور کے لئے اصل کتاب کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں۔

امام صاحب فرماتے ہیں، کہ "روح کے متعلق کئی طرح سے سوال کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اوّل یہ کہ آیا روح اپنی ماہیت کے لحاظ سے متحیز ہے یا کسی متحیز میں حال ہے یا موجود ہے۔ لیکن متحیز نہیں ہے اور نہ کسی متحیز میں حال

ہے۔ دوم :۔ یہ کہ آیا رُوح قدیم ہے یا حادث ہے۔ سوم :۔ یہ کہ آیا ارواح اجسام کی موت کے بعد باقی رہتی ہیں یا فنا ہو جاتی ہیں۔ چہارم :۔ یہ کہ ارواح کی سعادت و شقاوت کی حقیقت کیا ہے؟ بالجملہ رُوح کے متعلق بہت سے مباحث ہیں۔ ویسئلونک عن الروح میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے معلوم ہو سکے کہ ان کا سوال امورِ مافوق کے متعلق تھا یا کسی اور امر کے متعلق، لیکن ان کے جواب کے متعلق جو کہا گیا ہے کہ قُل الروح من امر ربی اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کا سوال مسائل مافوق میں سے دو مسئلوں کے متعلق تھا۔ اوّل رُوح کی ماہیت کے متعلق۔ دوم۔ رُوح کی قدامت اور حدوث کے متعلق۔

بحثِ اوّل رُوح کی ماہیت

پس ان کا یہ سوال تھا کہ رُوح کی حقیقت اور اس کی ماہیت کیا ہے؟ آیا رُوح عبارت ہے ان اجسام سے جو بدن کے اندر موجود ہیں اور جو طبائع اور اخلاط کے امتزاج سے پیدا ہوتے ہیں یا عبارت ہے نفسِ مزاج اور ترکیب سے یا عبارت ہے ایک عرض سے جو ان اجسام پر قائم ہو یا عبارت ہے ایک ایسے موجود سے جو ان اجسام و اعراض کی مغائر ہے، کیونکہ یہ اجسام امتزاجِ اخلاط و عناصر سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن رُوح ایسی نہیں ہے بلکہ ایک جوہر بسیط و مجرد جو خدا کے حکم "کُن" سے پیدا ہوتی ہے۔ پس ان اجسام و اعراض سے مغائر ہونے کی وجہ سے یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ رُوح کی کوئی حقیقت یا ہستی نہیں ہے کیونکہ کسی چیز کی

خاص حقیقت کے نہ جاننے سے اُس چیز کی حقیقت کی نفی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ بہت سی اشیاء ایسی ہیں جن کی حقیقت اور ماہیت مجہول ہیں لیکن ہم اُن سے انکار نہیں کر سکتے۔ مثلاً ہم جانتے ہیں کہ سکنجبین کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ صفرا کو قطع کرتا ہے لیکن اگر ہم اس خاصیت کی حقیقت اور ماہیت کو معلوم کرنا چاہیں تو ہرگز معلوم نہیں کر سکتے ہیں۔ پس ثابت ہو گیا کہ کسی چیز کی ماہیت نہ جاننے سے اُس کی نفی ثابت نہیں ہوتی۔ اسی نکتہ کی طرف خدا اشارہ کرتا ہے کہ وما اوتیتم من العلم الا قلیلاً۔

بحث دوم قرآن شریف میں لفظ "امر" کثرت کے ساتھ "فعل" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "وما امر فرعون برشید" پھر فرماتا ہے کہ فلما جاء امرنا، ان دونوں آیتوں میں لفظ "امر" فعل کے معنوں میں آیا ہے۔ پس قل الروح من امر ربی کے معنی "من فعل ربی" ہے۔ اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے رُوح کی قدامت اور حدوث کے متعلق سوال کیا تھا۔ لہٰذا خدا نے اُن کو جواب دیا کہ "رُوح حادث" ہے، کیونکہ وہ خدا کے فعل اور تکوین سے پیدا ہوئی ہے۔ پھر رُوح کے حدوث پر یہ دلیل قائم کی کہ وما اوتیتم من العلم الا قلیلاً، یعنی ارواح مبدء فطرت میں علوم اور معارف سے خالی ہوتی ہیں اور پھر ان کو علوم اور معارف حاصل ہو جاتے ہیں۔ پس یہ تغیر و تبدل ان کی حادث ہونے کی علامات ہیں۔

مسئلہ سوم:- انسان کی حقیقت کے متعلق مختلف لوگوں کے خیالات و آرا اور اُنکی تشریح، اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ انسان میں ایک شے ہے جس کی طرف انسان "انا" کے ساتھ اشارہ کرتا ہے۔ مثلاً انسان کہتا ہے کہ میں جانتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں۔ میں سنتا ہوں۔ میں چکھتا ہوں۔ میں چھوتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔ پس یہ ہے جس کی طرف ہر شخص لفظ "میں" سے اشارہ کرتا ہے یا تو جسم ہے یا عرض ہے یا ان دونوں کا مجموعہ ہے یا ایک ایسی شے ہے جو جسم اور عرض کی متاثر ہے۔

مذہب اوّل کی تردید جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ "انسان جسم ہے" تو اُس جسم سے مُراد یا تو یہ بدنِ محسوس ہے، یا ایک ایسا جسم مُراد ہے جو اس بدن کے اندر داخل ہے یا ایسے جسم سے مُراد ہے جو بدن کے باہر ہے۔ ہم ثابت کریں گے کہ اُن کا یہ قول کہ "انسان جسم ہے" سراسر باطل ہے۔ ان کی بطالت کے لئے دلائل ذیل ملاحظہ ہوں:-

دلیل اوّل ہر شخص بالبداہت جانتا ہے کہ اس بدن کے اجزا ہمیشہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی زیادت کی وجہ سے اور کبھی نقصان کی وجہ سے اور کبھی نمو کی وجہ سے اور کبھی ذبول کی وجہ سے اور کبھی موٹاپے کی وجہ سے اور کبھی دُبلا ہونے کی وجہ سے پس جو متغیّر و متبدّل ہے غیر ہے اس چیز سے جو غیر متبدّل اور علےٰ حالہٖ باقی

ہے۔ لہٰذا ثابت ہے کہ انسان کبھی بدن سے تعبیر نہیں ہو سکتا۔

دلیل دوم | جب انسان کسی خاص امر کے متعلق غور و خوض میں مستغرق ہوتا ہے تو اس حالت میں وہ اپنے تمام اجزائے بدن سے غافل اور بے خبر ہو جاتا ہے لیکن اپنے نفس اور ذات سے اس استغراق کی حالت میں بھی غافل نہیں ہوتا جس کی دلیل یہ ہے کہ وہ ایسی حالت میں بھی ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے نفس معیّنہ سے غافل نہیں ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ میں نے دیکھ لیا۔ میں نے سن لیا وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے جملوں میں ضمیر "میں" امر کو ظاہر کرتا ہے کہ اگرچہ وہ اپنے تمام اجزاء و اعضائے بدن سے بے خبر ہے، لیکن اپنی ذات اور نفس سے بے خبر نہیں ہے۔ پس جو چیز معلوم ہے غیر اس چیز سے جو غیر معلوم ہے۔

دلیل سوم | از روئے عقل یہ جائز ہے کہ انسان جب چاہے اپنے بدن کے اجزاء و اعضاء کو اپنے نفس کی طرف مضاف کرے۔ مثلاً کوئی کہے میرا سر، میرا ہاتھ، میرا دل، میری زبان وغیرہ وغیرہ چونکہ مضاف اور مضاف الیہ میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے، لہٰذا ثابت ہے کہ انسان بدن اور اس کے تمام اجزاء و اعضاء کے علاوہ کوئی اور چیز ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح انسان یہ کہتا ہے کہ "میرا سر، میرا ہاتھ وغیرہ" وہ یہ بھی کہتا ہے کہ "میری ذات، میرا نفس"

یہاں انسان اپنی ذات کو اپنی ذات کی طرف اور اپنے نفس کو اپنے نفس کی طرف مضاف کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی ذات اُس کی ذات کے اور اُس کا نفس اُس کے نفس کے مغائر ہے اور یہ محال ہے۔
اس کا جواب یہ ہے کہ جب انسان میری ذات اور میرا نفس کہتا ہے تو اس سے مراد اُس کی شخصیت ہوتی ہے نہ کہ اُس کی حقیقتِ معینہ جس کو وہ لفظ "مَیں" سے تعبیر کرتا ہے، کیونکہ نفس و ذات کو دوبارہ اضافت دے دینا محال ہے۔ کیا کبھی تم نے کسی انسان کو یہ کہتے سُنا ہے، کہ "میرا انسان" کیونکہ انسان اُس کی حقیقت ہے۔ اس لئے اس کو دوبارہ مضاف نہیں کرسکتا ہے۔

دلائل چہارم و پنجم و ششم و ہفتم و ہشتم و نہم قرآن شریف کی متعدد آیات واحادیث پر مبنی ہیں چونکہ مسیحی دُنیا میں بلکہ خود مسلمانوں میں بہت کم ایسے لوگ ہیں، جن کو قرآن فہمی و حدیث دانی کی طرف رغبت ہو۔ لہٰذا ان دلائل کے لکھنے سے چنداں فائدہ متصوّر نہیں ہوتا۔

دلیل دہم "ہم دیکھتے ہیں کہ دُنیا میں جتنے فرقے ہیں خواہ وُہ ہندی ہوں یا رُومی، عربی ہوں یا عجمی، اور تمام اہلِ مذاہب یہودی، عیسائی، مجوسی، مسلمان وغیرہ اپنے مُردوں کے لئے صدقہ[۱] دیتے ہیں اور

---

[۱] اس دلیل کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے W.O. Oesterley صاحب کی مستند اور شہرۂ آفاق کتاب Immortality and the Unseen World. کے صفحہ ۹۵ - صفحہ ۱۲۳ تک ملاحظہ فرمائیے (مترجم)

ان کے لئے دعائے خیر کرتے ہیں اور ان کی زیارت کرتے ہیں۔ اگر ان کی ارواح جسم کی موت کے بعد زندہ نہ ہوتیں تو ان کی خیرات اور دعائے زیارت عبث ہوتیں۔ یہ تمام باتیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ نظرتِ سلیمہ گواہی دیتی ہے کہ انسان ایک شے ہے جو اس بدن سے سراسر علیحدہ ہے اور یہ شے کبھی نہیں مرتی، بلکہ جسد مرتا ہے۔

دلیل یازدہم اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض اشخاص نے اپنے خویش و اقارب کی موت کے بعد اُن میں سے کسی کو خواب[1] میں دیکھا ہے اور خواب میں اُس کو بتلا دیا ہے کہ فلاں جگہ میں نے سونا دفن کیا ہے۔ خواب سے بیدار ہونے کے بعد جب وہ شخص وہاں گیا تو ہو بہو ویسا ہی پایا ہے جیسا کہ خواب میں اُس کو کہا گیا تھا۔ پس اگر انسان موت کے بعد باقی نہ رہتا تو اس قسم کے خواب صحیح نہ ہوتے۔

دلیل دوازدہم جب انسان کے اعضاء میں سے کوئی عضو کٹ جاتا ہے یا فاسد ہو جاتا ہے تو انسان اپنی ذات میں یہ تصوّر کرتا ہے کہ میں ویسا ہی سالم اور ثابت ہوں، جیسا کہ ان اعضاء کے کٹ جانے یا فاسد ہو جانے سے پہلے صحیح و سالم تھا۔ قطعی دلیل ہے اِس پر کہ انسان اور چیز ہے اور بدن اور چیز ہے۔

دلائل سیزدہم و چہاردہم و پانزدہم قرآن شریف اور اسلامی شریعت پر مبنی ہیں۔ لہٰذا ہر وہ سابق ان کو

---

[1] حیات بعد الممات کی بحث میں زمانہ حاضرہ کی تحقیقات میں سے بہت سی مثالیں پیش کی جائیں گی۔ (منہ)

چھوڑ دیتے ہیں۔

دلیل شانزدہم جب آپ زید کے ساتھ بات چیت کرتے ہیں اور اس کو مخاطب حکم دیتے ہیں کہ یہ کر اور یہ نہ کر تو آپ کا مخاطب اور نامور اور منہی زید کا کوئی عضو نہیں ہو سکتا۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نامور و منہی زید کا بدن یا اس کے اعضا نہیں، بلکہ کوئی اور چیز ہے جو اس بدن کی مغائر ہے۔ اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ کیوں جائز نہیں کہ نامور و منہی جملہ بدن ہو نہ کہ اس کا کوئی عضو یا کوئی حصہ۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جملہ بدن اس وقت مخاطب و منہی ہو سکتا ہے، اگر وہ عالم و ذی فہم ہو۔ اور فرض کر لو کہ جملہ بدن عالم و ذی فہم ہے تو اس صورت میں علم واحد یا مجموعہ بدن کے ساتھ قائم ہوگا، یا بدن کے ہر ایک جزو کے ساتھ قائم ہوگا۔ صورتِ اول میں متعدد جگہوں میں عرض کا قیام لازم آئے گا، جو محال ہے۔ صورتِ دوم میں لازم آئیگا کہ انسان کے بدن کا ہر ایک جزو بالاستقلال عالم ذی اور ذی ادراک ہو، جو انسانی مشاہدہ کے سراسر خلاف ہے۔

دلیل ہفدہم یہ دلیل بھی قرآن شریف کی آیات پر مبنی ہے۔ لہٰذا اس کے ترجمہ اور نقل کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ قسم دوم یہ تھی کہ انسان عرض ہے جو بدن میں حال ہے۔ کوئی عقلمند شخص اس عندیہ کا قائل نہیں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ہر ایک شخص یقینی طور پر جانتا ہے کہ انسان جوہر ہے، کیونکہ وہ علم۔ قدرت۔ تدبیر اور تصرف

کے ساتھ موصوف ہے۔ جو چیز اس قسم کی صفات کے ساتھ موصوف ہوتی ہے وہ جوہر ہے اور جوہر عرض نہیں ہوتا ہے۔

قسم سوم یہ تھی کہ انسان موجود ہے۔ وہ نہ جسم ہے اور نہ جسمانی۔ یہ اُن فلاسفروں کا قول ہے، جو خدا پرست ہیں اور بقائے رُوح اور معادِ رُوحانی اور ثواب و عذابِ رُوحانی کے قائل ہیں۔ مسلمان علماء کی ایک بڑی جماعت مثلاً شیخ ابی القاسم راغب اصفہانی اور شیخ ابی حامد الغزالی اور قدما معتزلہ میں سے معمر بن عباد السلمی اور اہل تشیع میں سے شیخ المفید، اور کرامیہ میں سے ایک جماعت اس کے قائل ہیں۔ (تفسیر کبیر جلد ششم ص۴۲۴ تا ص۴۲۵ مطبوعہ مصر)۔

اس کے بعد امام صاحب از روئے عقل رُوح پر بحث کرتے ہیں۔ چونکہ ان دلائل کا سمجھنا کارے دارد کا مصداق ہے، ہم ان کو نقل نہیں کرتے۔ اگر کسی صاحب کو شوق ہو تو اصل کتاب کا مطالعہ کریں اور لطف اُٹھائیں۔

شیخ الرئیس یعنی بوعلی سینا اور رُوح

شیخ الرئیس کی کتاب "اشارات" فلسفہ میں ایک بے مثل کتاب ہے۔ اسی کتاب میں سے رُوح کے متعلق ایک بحث کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

رُوح کے وجود کی دلائل

"انسان کسی حالت میں بھی اپنی ذات کے ادراک سے غافل نہیں ہو سکتا۔

اوّل یہ کہ جب انسان صحیح المزاج ہوتا ہے یا اس کے علاوہ کسی حال میں ہو بشرطیکہ اس کی فطرت صحیح ہو تو اپنی ذات کے وجود سے غافل نہیں ہوتا۔ دوم یہ کہ نائم حالت نوم میں اپنے نفس کا ادراک کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس کو زور سے آواز دی جاتی ہے تو چونک پڑتا ہے۔ سوم یہ کہ سکران اپنی ذات کو اپنے آپ سے علیحدہ نہیں سمجھتا۔ اگرچہ اس کے حافظہ میں اس کی ذات کا تمثل نہ ہوگا، مگر اپنی ذاتِ مخصوصہ کا ادراک اس سے ہوتا ہے۔ چہارم یہ ہے کہ اپنی ذات کو اوّل خلقت میں صحیح المزاج والعقل خیال کرے اور یہ بھی خیال کرے کہ وہ اپنے اعضا کو نہیں دیکھتا یا اس کے اعضا علیحدہ علیحدہ ہیں اور ایک لحظہ کے لئے ہوا طلق (بے عیب) میں معلق بین السما والارض ہو تو ایسی حالت میں اگرچہ ہر شئے سے غافل ہوگا مگر اپنی ذات سے غافل نہ ہوگا۔

تنبیہ:۔ اس صورت میں بلکہ تمام حالات میں انسان اپنی ذات کا ادراک کس طرح کرے گا۔ کیا اپنے حواسِ ظاہرہ سے یا باطنہ سے (جیسے عقل) یا پھر اگر حواسِ باطنہ سے ادراک کرتا ہے تو کیا کسی واسطہ سے یا بلاواسطہ۔ یہ تو ہو نہیں سکتا، کہ کسی واسطہ سے ادراک کرے کیونکہ جمیع وسائط وعلائق سے مجرّد فرض کر چکے ہیں، جیسا کہ اوپر گذرا۔ پس باقی رہا یہ کہ انسان کسی غیر قوت کے افتقار اور واسطہ کے بغیر اپنی ذات کا ادراک کرتا ہے تو ثابت ہوا کہ انسان یا تو مشاعرہ ظاہرہ سے ادراک اپنی ذات کا کرتا ہے یا عقل کے بغیر کسی واسطہ کے۔

صرف رُوح ہی مدرک ہے

تنبیہ :- پھر یہ دیکھنا ہے کہ جسم انسانی میں مدرک اس کا اباب ہو یعنی ظاہری جلد جس کو بصر ادراک کرتی ہے یہ تو صحیح نہیں، کیونکہ اگر ظاہری جلد جُدا کر دی جائے، تو بھی انسان اپنی ذات کا مدرک رہتا ہے۔ نہ ہی مدرک وُہ ظاہری اعضا ہو سکتے ہیں، جن کا حس لامسہ ادراک کرتی کیونکہ اس کا بھی وُہی حال ہے جو اُوپر گذرا۔ نیز یہ کہ ہم بدنِ انسانی کو حواسِ ظاہرہ سے غافل اور مجرّد فرض کر چکے ہیں۔ پس ثابت ہُوا کہ بدنِ انسانی میں مدرک اس کے اعضا نہیں (جیسے قلب، دماغ وغیرہ) اس لئے کہ ان کا تو وجُود ہی مخفی ہے بغیر تشریح کے انسان ان کو معلوم ہی نہیں کر سکتا اور تشریح اعضا سے تغافل فرض کر چکے ہیں اور نہ ہی مجموعہ بدن انسانی مدرک ہو سکتا ہے اور یہ ایک ظاہر بات ہے کیونکہ جب اس کے نفس کا امتحان کیا جائے تو انسان اپنی ذات کو مدرک پاتا ہے اور اعطاء کی تفصیل سے غافل ہوتا ہے۔

پس معلوم ہُوا کہ مدرک ان اشیاء کے علاوہ کوئی اور چیز ہے کیونکہ ان سے انسان تو غافل بھی ہو سکتا ہے مگر اپنی ذات سے غافل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ اشیاء اس کے مدرک لذات ہونے کے لئے ضروری نہیں۔ الحاصل ثابت ہُوا کہ مدرک نہ تو محسوسات ہیں، اور نہ وُہ جو مشابہ محسوسات کے ہیں جن کا آئندہ تذکرہ آئے گا۔ جیسے شئی متخیل اور موہوم۔ اگر یہ استدلال کیا جائے کہ انسان اپنی ذات کو بواسطہ فعل ادراک یعنی اپنے فعل سے

اپنی ذات کو پہچانتا ہے کیونکہ فعل بغیر فاعل کے ہو ہی نہیں سکتا، تو جب فعل کا ثبوت ہو گیا تو اس کے واسطہ سے اثباتِ ذاتِ فاعل بھی ہو گیا۔ یہ کئی وجوہ سے باطل ہے۔ اوّل یہ کہ ہم انسان کو غافل فرض کر چکے ہیں۔ اپنے افعال سے باوجود اس کے پھر وہ اپنی ذات سے غافل نہیں۔ لہٰذا فعل کو واسطہ بنانا صحیح نہیں۔ علاوہ ازیں یہ ہے کہ فعل یا عام ہوگا یا خاص۔ اگر عام ہے تو اس سے صرف فاعل ما کا اثبات اور ادراک ہوگا نہ خاص ذاتِ فاعل کا اور اگر وہ فعل خاص ہو ذاتِ فاعل خاص سے، تو بھی خاص ذات فاعل کا ادراک نہ ہوگا، کیونکہ وہ فاعل معیّن اس معیّن فعل سے قبل معلوم ہوگا، یا کم از کم فعل اس کے ساتھ ہوگا۔ پھر بھی اس فعل سے ذاتِ فاعل کا ادراک نہ ہوا۔ الحاصل فعل سے ذاتِ فاعل پر استدلال کرنا استدلال ناقص ہے۔ اس سے ذاتِ فاعل کا ادراک نہیں ہو سکتا۔ پس انسان کا اپنے فعل کے واسطہ سے اپنی ذات کا ادراک کرنا محال ہے۔

رُوح نہ جسم ہے اور نہ مزاج

اشارہ: انسان کا نفس اس کی جسمیت اور مزاج کے غیر ہے کیونکہ انسان جب حرکت کرتا ہے تو اپنی جسمیت کے علاوہ کسی شے سے اس کا تحرک ہوتا ہے کیونکہ جسمیت تو سب میں مشترک ہے اور اگر صرف جسمیت ہی تحرک کا سبب ہوتی تو تمام اجسام میں حرکتِ ارادی ہونی چاہیے تھی، خواہ جمادات ہوں یا نباتات، اور نہ ہی انسان کی حرکت اس

مزاجِ جسمانی کی وجہ سے ہے کیونکہ مزاج تو انسان کی جہتِ حرکت میں
حرکت کرنے سے مانع ہوجاتا ہے۔ چنانچہ جب آدمی تھک جاتا ہے
تو حرکت کرنے سے اس کا مزاج اس کو روکتا ہے بلکہ نفسِ حرکت میں مزاج
مانع ہوتا ہے جیسے رعشہ وغیرہ تو اگر مزاج ہی موجبِ حرکت ہوتا تو مانع
نہ ہوتا۔ ایسے ہی انسان کی جسمیت اور مزاجِ جسمانی مبدا ادراک
نہیں، کیونکہ مزاج ایک کیفیت ہے جو اپنے شبیہ کا ادراک نہیں کرسکتی۔
پس اگر مدرک مزاج کا شبیہ اور مثل ہوگا تو وہ اس کا ادراک نہیں
کرسکتا اور اگر مزاج کی ضد مدرک ہو تو ہر واحد ان دونوں میں سے
ایک دوسرے سے متاثر ہوگا، اور تاثیر کے ضروری ہے کہ کیفیتِ مزاجیہ
اولیٰ زائل ہوجائے گی اور دوسری پیدا ہوجائے گی، کیونکہ وہ کیفیتِ مزاجیہ
معدوم ہوچکی ہے، لہٰذا مدرک نہیں ہوسکتی اور نہ اس سے حس ہوسکتا ہے
دوسری دلیل یہ ہے کہ مزاج تو ایک ایسی کیفیت ہے جو اضداد متنازعہ
الی الانفکاک کے امتزاج کے تابع ہے اور ان اضداد کو التئام اور امتزاج
پر مجبور کرنے والی قوت مزاج کے علاوہ ہے۔ اس لئے کہ مزاج تو التئام
کے بعد حاصل ہوتا ہے اور التئام کی علت اور اس کی محافظ امتزاج اور
التئام سے قبل ہونی چاہیئے اور یہ قاعدہ ہے کہ جو شے قبل ہے وہ بعد
نہیں ہوسکتی۔ تو ثابت ہوا کہ قوای محرکہ اور مدرکہ اور حافظ للمزاج کی
اصل کوئی شے ہے جس کو نفس کہتے ہیں۔ یہی وہ جوہر ہے جو انسانی بدن
کے اجزاء میں تصرف کرتا ہے۔ پھر تمام بدن میں تصرف کرتا ہے۔ یہ جوہر
تجھ میں ایک ہی ہے بلکہ وہ تو ہی ہے۔ نفس کی کئی ایک فروع ہیں،

یعنی وُہ قوٰی جو بدنِ انسانی کے اعضاء میں منتشر ہیں۔

نفسؔ کا بھی اپنے بدن سے تاثّر ہوتا ہے۔ پس اگر تُم اپنے اعضاء میں سے کسی ایک کے ساتھ کسی شے کو محسُوس کرو یا کُچھ خیال کرو یا کسی چیز کی اشتہا کرو، یا تُم میں غضب آجائے تو نفس میں ایک ہیاۃ پیدا ہو جائے گی۔ اس علاقہ کی وجہ سے جو اس میں اور ان قوٰی (فروع) میں ہے۔ حتیٰ کہ اگر افعالِ مذکورہ بالا مکرّر سہ کرر ہوں گے تو نفس جلدی متاثر ہوگا، یہانتک کہ یہ افعال نفس کے لئے بمنزلہ خلق اور عادت کے ہو جائیں گے۔ فافہم وتدبر فانہ دقیق۔

بدن بھی نفس سے متاثر ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب نفس میں کوئی ہیئت عقلیہ حاصل ہوتی ہے تو اسی علاقہ کی وجہ سے اس ہیئاۃ کا اثر فروع اور اعضائے بدن تک بھی پہنچے گا۔ جیسے جب انسان خُدائے قدّوس کی جبروت میں تفکّر کرے تو بدن پہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ انفعالات اور ملکات کبھی قوی ہوتے ہیں اور کبھی ضعیف ہوتے ہیں کیونکہ اگر یہ ہوتا تو لوگ اخلاقِ فاضلہ اور رذیلہ میں متفاوت نہ ہوتے۔

(اشارات النمط الثالث)

لے زمانہ حاضرہ کی تازہ حکیمانہ تحقیقات سے بھی یہ ثابت ہوچکا ہے کہ رُوح بدن پر اور بدن رُوح پر اثر انداز ہوتا ہے چنانچہ Physcho-Physical Interaction کے نظریہ کے مطابق ہر خیال جو ذہن میں پیدا ہوتا ہے نظامِ عصبی پر اثر کرتا ہے اس کے ساتھ ہی ہر ایک تبدیلی جو دماغ میں پیدا ہوتی ہے وُہ رُوح پر اثر کرتی ہے۔ اس نظریہ کے مطابق رُوح اور جسم دونوں امتناعانہ طور پر کام کرتے ہیں لیکن ایک دُوسرے پر منحصر ہیں۔

Immortality by H. B. Streeter. p. 24.

رُوح کی بقا کی بحث

تنبیہ۔ غور کرو کہ کس طرح وجُود کی ابتداء ہُوئی، اشرف فاشرف ہے، اخس کی طرف حتےٰ کہ اس کی انتہا ہُوئی ہیولیٰ تک۔ پھر عود ہُوا احسن در احسن سے اشرف کی طرف حتیٰ کہ اس کی انتہا ہُوئی نفسِ ناطقہ اور عقلِ مستفاد تک نفس بعد الموت باقی رہتا ہے، کیونکہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ نفسِ ناطقہ جو کہ صور عقلیہ کا محل ہے جسم میں حال نہیں اور نہ ہی فی ذاتہا وجوہر یا بدن کے ساتھ تعلق رکھتا ہے بلکہ اس کا تعلق بدن کے ساتھ صرف اس طور پر ہے کہ بدن اس کے اکتسابِ کمالات کے لئے آلہ ہے۔ پس جبکہ بدن فاسد ہو جائیگا، تو چونکہ نفس کو اپنے وجُود میں اس کی طرف احتیاج نہ تھی۔ نیز اس کی علتِ تامہ (جواہر عقلیہ مجردہ) بھی موجُود ہے۔ لہٰذا نفس بھی باقی رہے گا فنا نہ ہوگا۔

تبصرہ :۔ نفسِ ناطقہ اپنے افعال میں بدن سے غنی ہے۔ پس وُہ فی ذاتہا بھی بدن سے غنی ہوگی۔ اوّل کا بیان یہ ہے کہ اگر نفس کا تعقّل بوجہ بدن کے ہوتا تو جبکہ بدن کو کلال واقع ہوتا تو ضروری تھا کہ قوّتِ عاقلہ کو بھی کلال اور ضعف واقع ہوتا۔ حالانکہ ایسا نہیں، کیوں بدن چالیس سال کے بعد زوال پذیر ہوتا ہے، حالانکہ قوّتِ عاقلہ اُس وقت ترقی کرتی ہے اور نیز اگر نفس کا ادراک بسبب آلہ ہوتا تو وُہ نہ اپنا ادراک کر سکتا نہ اپنے آلہ کا اور نہ ہی اس امر کا مدرک ہوتا کہ میں اپنے نفس کا مدرک ہُوں اور اپنے آلہ کا مدرک ہوگا، کیونکہ نفس اور ان اشیاء کے درمیان کوئی آلہ نہیں

جس کی وجہ سے ادراک کرے۔ پس جبکہ ثابت ہو گیا کہ نفس اپنے فعل میں مستغنی عن البدن ہے تو واجب ہے کہ وہ اپنی ذات میں بھی غنی عن البدن ہو، کیونکہ فعل تو فرع علی الذات ہوتا ہے۔

زیادہ تبصرہ۔ قوائے بدنیہ مکرر کر فعل کرنے کی وجہ سے تھک جاتی ہیں، اور جس وقت وہ قوی کا شعور کرتی ہیں تو ضعیف کا شعور نہیں کر سکتیں، چنانچہ رائحہ ضعیفہ بعد قویہ کے مشعور بہا نہیں ہوتی، بخلاف قوتِ عاقلہ کے اس کا حال ماذکر سے علیحدہ ہے یعنی اس میں مکرر فعل کی وجہ سے کلال نہیں آتا۔

زیادہ تبصرہ۔ اگر قوتِ عاقلہ منطبعہ فی الجسم ہو مثلاً دماغ و قلب تو اس قوتِ عقلیہ کو یا جسم کا دائماً تعقل ہوگا یا دائماً نہ ہوگا بلکہ وقتاً دُون وقت ہوگا۔ اگر دائماً تعقل نہ ہو بلکہ اس لئے اس کو بعد میں جانا تو ظاہر ہے کہ اس معقول کی صورت کا حصول اُس قوت میں موجو حال فی الجسم ہے اور اس جسم کی صورتِ حال فی الصورۃ العقلیہ ہے تو اس جسم متعقل کی صورتِ حال فی الجسم ہوئی، کیونکہ حال فی الحال فی الشئی حال فی الشئی ہوتا ہے تو جو صورت کہ اس جسم کے ساتھ ماہیت میں مساوی ہے اس میں حال ہوئی۔ پس اجتماع مثلین لازم آیا، حالانکہ یہ محال ہے۔ الحاصل ثابت ہوا کہ صورتِ عاقلہ منطبعہ فی الجسم و لاآلہ نہیں ہے۔

اشارہ۔ چوں ثابت ہوا کہ نفس بدن سے مستغنی ہے تو واجب ہے کہ بدن کے مرنے کے بعد باقی رہے، جب یہ ثابت ہوا تو ہم کہتے ہیں کہ

اگر نفس پر فساد صحیح ہو تو لازم آئے گا۔ نفس کا مرکب عن المادہ والصورۃ ہوتا لیکن نفس تو مجرد ہے اور ہر مجرد عاقل اور معقول ہوتا ہے اور جس کی یہ شان ہو وہ باقی ہوتا ہے۔ پس نفس باقی ہے۔ شبہ وارد ہوتا ہے، کہ اعراض باوجود بسائط ہونے کے باقیہ اور ممکنۃ الفساد ہیں تو نفس بھی ایسا ہی ہو سکتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اعراض کا فی نفسہا وجود چونکہ محالہا ہوتا ہے، لہٰذا امکانِ فساد ان میں بوجہ ان کے محال کے ہوتا ہے اور یہ ان کے بسیط ہونے کے منافع نہیں ہے، بخلافِ نفس کے کہ اس کے لئے محل نہیں۔ لہٰذا اس میں امکانِ فساد اور بقا منافی لبساطتہا ہے۔ (النمط سابع فی التجرید)

النمط سابع فی التجرید

وہم و تنبیہ۔ بعض ان میں سے یہ کہتے ہیں کہ جوہر عاقل جب کسی شے کا تعقل کرتا ہے تو وہ جوہر عاقل بعینہٖ وہی صورت شے بن جاتا ہے، حالانکہ یہ بالبداہتہ محال ہے، کیونکہ اتحاد کے وقت اگر دونوں موجود ہوں گے تو وہ دونو اثنین ہوئے فلا اتحاد۔ اگر دونوں معدوم ہو گئے تو وہاں اتحاد نہ رہا بلکہ ثالث شے حادث ہو گئی اور ایک باقی رہا اور ایک فنا ہو گیا۔ تو چونکہ فانی باقی نہیں ہے، لہٰذا اس صورت میں بھی اتحاد نہ رہا۔

زیادہ تنبیہ۔ پھر ہم یہ کہتے ہیں کہ جوہر عاقل جب آ کا تعقل کرے پھر با کا تعقل کرے۔ پس اب اگر اس کا آ ہونا باطل ہو گیا تو وہ متحد والذات عند کل تعقل ہو گا۔ اگر کونہ آ باطل نہیں ہوا بلکہ باقی ہے تو اس

وقت باآنہ ہوگا تو پھر اُن کا مذہب باطل ہوگیا اور اگر آ ہوتے ہوئے پھر باآ ہوگیا تو اتحاد عاقل بالمعقول مانتے ہوئے یہ بھی کہنا پڑے گا، کہ جمیع معقولات باوجود اپنی مختلفہ ماہیات کے متحدہ ہیں حالانکہ یہ باطل ہے۔

شیخ الاسلام ابن قیم جوزی اور رُوح

ابن قیمؒ نہ تو رُوح کو عرض من اعراض بدان تسلیم کرتے اور نہ جوہر مجرّد تسلیم کرتے ہیں، بلکہ رُوح کو ایک خاص جسم نورانی تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ اپنی مشہور و معروف کتاب میں جس کا نام کتاب الرُوح ہے لکھتے ہیں کہ:-

قائلین جسمیت جسم کی تعیین میں باہم مختلف ہیں۔ چنانچہ گروہ ششم کا یہ قول ہے کہ:-

رُوح نورانی اور جسم لطیف ہے

رُوح جسم تو ہے لیکن اس جسم مخصوص سے بالماہیت مختلف ہے۔ رُوح ایک جسم نورانی علوی ہے جو بہت ہی لطیف ہے زندہ ہے متحرک ہے اعضا کے جوہر میں نفوذ کرتی ہے اور ان میں اس طرح ساری رہتی ہے جس طرح گلاب میں پانی اور زیتون میں چکنائی اور کوئلہ میں آگ۔ جب تک انسانی اعضاء اس جسم لطیف کے فیضان کی قبولیت کی صلاحیت رکھتے ہیں اس وقت تک یہ جسم لطیف ان اعضا میں مشابک رہتا ہے اور برابر ان کو حس و حرکت ارادیہ سے مستفید کیا کرتا ہے اور جب یہ اعضاء اخلاطِ غلیظ کے غلبہ کی وجہ سے فاسد ہو جاتے ہیں اور ان آثار کی قبولیت

کی صلاحیت ان میں باقی نہیں رہتی۔ تب رُوح بدن سے علیحدہ ہو کر عالمِ ارواح کی طرف کُوچ کرتی ہے۔"

ابنِ قیمؒ فرماتے ہیں کہ یہ قول اصح الاقوال ہے اور اس کے علاوہ باقی سَب باطل ہیں۔ اسی پر قرآن واحادیث واجماع صحابہ اور عقل وفطرت گواہی دیتی ہیں چنانچہ ہم اس کی تائید میں دلائل پیش کرتے ہیں۔"
(کتاب الرُّوح صفحہ ۲۸۴، مطبوعہ حیدر آباد)

علاّمہ موصُوف نے قولِ بالا کی تائید میں ایک سو سولہ دلائل پیش کئے ہیں۔ پھر اُن بائیس اعتراضات کے جواب دیئے ہیں جو مسئلہ جسمیتِ رُوح پر وارد ہو سکتے ہیں۔

چنانچہ معترضین کے اعتراض اوّل کے جواب میں جسم کی لغوی اور اصطلاحی تشریح کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ:-

کس لحاظ سے رُوح جسم ہے

جب ہم رُوح کو جسم کہتے ہیں تو فلسفیوں کی اصطلاح اور اُن کے طرزِ خطاب پر کہتے ہیں۔ ورنہ رُوح کو لُغت کے اعتبار سے ہرگز جسم نہیں کہتے ہیں۔ جب ہم رُوح کو جسم کہتے ہیں تو اس سے ہمارا مقصُود ذیل کی صفات کا ثابت کرنا ہوتا ہے جن پر شریعت اور عقل دونوں گواہی دیتی ہیں۔ مثلاً رُوح صاحبِ ادراک ہے۔ متحرک بالارادہ ہے۔ وہ منتقل ہوتی ہے، صعُود کرتی ہے، نزُول کرتی ہے۔ وہ نعیم اور عذاب لذّت اور الم سے متکیف ہو جاتی ہے۔ وہ محبُوس ہو سکتی ہے۔ آزاد

کی جا سکتی ہے۔ قبض ہو سکتی ہے۔ داخل ہو سکتی ہے۔ خارج ہو سکتی ہے۔
ان صفات کے لحاظ سے ہم رُوح پر جسم کا اطلاق کرتے ہیں، تاکہ یہ
معانی رُوح میں متحقق ہو جائیں۔" (کتاب الرُوح ص ۳۱۶ و ص ۳۱۷)

مصنّف "حیات النفوس" اور رُوح

مُصنّف "حیات النفوس" رُوح کے تجرّد کے قائل ہیں
یعنی رُوح کو نہ جسم مانتے ہیں اور نہ جسمانی۔ چنانچہ رُوح کے وجود اور تجرّد
کے لئے بہت سی دلائل نقل کرتے ہیں۔ ہم ان دلائل میں سے چند دلائل
جن کا سمجھنا چنداں مُشکل نہیں ہے ذیل میں ترجمہ کر کے لکھتے ہیں:-

دلیل اوّل

ہر ایک انسان بشرطیکہ اُس کی عقل میں فتور نہ ہو، خواہ
بیدار ہو یا خواب میں ہو، خواہ ہوشیار ہو یا مست ہو،
حتّٰے کہ اگر یہ فرض کیا جائے کہ وُہ ابھی ابھی اچانک پیدا ہُوا ہے اور اُسے
کسی طرح کا ادراک حاصل نہیں ہُوا ہے اور ایک ایسی ہَوا میں معلّق ہے جو
تمام کیفیات سے خالی ہے۔ تب بھی وُہ اپنی ذات سے غافل نہیں ہو
سکتا، حالانکہ وُہ تمام اجسام و اعراض سے غافل ہو جاتا ہے۔ اس دلیل
سے ثابت ہے کہ رُوح اجسام و اعراض سے علیٰحدہ کوئی چیز ہے۔

دلیل دوم

انسانی ابدان و اعراض کی طرف لفظ "مَیں" سے اشارہ نہیں
ہو سکتا ہے اور جس کی طرف لفظ "مَیں" سے اشارہ نہیں
ہو سکتا وُہ مفہوم "مَیں" سے خارج ہے لہٰذا تمام اجسام و اعراض رُوح
کے مفہوم سے خارج اور انسانی ذات سے جُدا ہیں۔

دلیل سوم اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم ایسی بسیط چیزوں کا تعقل کرتے ہیں جن کے اجزا نہیں ہوتے۔ مثلاً وحدتِ مطلق کا تعقل۔ پس جو چیز اس قسم کے بسائط کا تعقل کرتی ہے، وہ نہ تو جسم ہو سکتی ہے اور نہ جسمانی۔ کیونکہ اگر یہ تعقل کنندہ جسم ہو یا جسمانی تو اس کی تقسیم ہو سکتی ہے، اور اس کی تقسیم سے وحدتِ مطلق کی تقسیم لازم آئیگی جو محال ہے۔ کیونکہ اگر وحدتِ مطلق تقسیم ہو سکے تو اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں (۱) یا تو اجزائے مختلفہ میں تقسیم ہو جائیگی یا (۲) اجزائے متشابہہ میں۔ صورتِ اوّل باطل ہے کیونکہ بسیط کے اجزائے مختلفہ نہیں ہوتے۔ صورتِ دوم بھی باطل ہے، کیونکہ اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ (۱) اجزائے مشتبہ کے ہر ایک جزء یا تو فقط وہی بسیط ہوگا یا (۲) دوسرے جزء سے مل کر وہی بسیط ہوگا یا (۳) وہی بسیط نہ ہوگا۔ صورتِ اوّل باطل ہے کیونکہ اس صورت میں جزء و کل میں فرق نہ رہے گا۔ صورتِ دوم اس لئے باطل ہے کہ اس سے لازم آئے گا کہ جزء کل پر زائد ہو۔ تیسری صورت بھی باطل ہے، کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ لاشئ جزء شئ ہو اور لا وحدت جزء وحدت ہو۔

دلیل چہارم اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم کلّی کے معنی جانتے ہیں۔ مثلاً جسمیت، انسانیت اور حیوانیت کے معنوں سے ہمیں خوب علم ہے کہ ان میں سے ہر ایک مختلف چیزوں پر صادق آتی ہے۔ جسم آسمان اور زمین اور دیگر اشیاء پر صادق آتا ہے۔ انسان

زید و عمر و دوسروں پر صادق آتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہ ضرور ہے کہ معنائے کلی وضع اور مقدار سے خالی ہو۔ ورنہ ان چیزوں پر جو مختلف وضع اور مقدار کے مالک ہیں صادق نہ آتا۔ لہٰذا ثابت ہے کہ معنائے کلی وضع و مقدار اور دیگر عوارض لاحقۂ اجسام سے بالکل مجرّد ہے جب معنائے کلی مجرّد ہے تو ضرور ہے کہ اس کا محل بھی ان عوارض و لواحق سے مجرّد ہو، کیونکہ جو چیز ایسے محل میں حال ہو جو ذی وضع اور مقدار ہو تو حال کا بھی ذی وضع اور مقدار ہونا لازم ہے۔ چونکہ حال ذی وضع اور مقدار نہیں ہے، تو اس کا محل بھی ذی وضع اور مقدار نہیں۔ پس نفس انسانی ذی وضع اور مقدار نہیں ہے"۔ (حیات النفوس ص۲۲۹ و ص۲۳۶)

دلیل پنجم و ششم کا نقل کرنا قارئین کو سمجھنے کی تکلیف دیتا ہے۔ دلیل ہفتم و ہشتم و نہم و دہم شیخ الرئیس کی کتاب اشارات سے ماخوذ ہیں جن کو ہم نقل کر چکے ہیں۔

ان مسلمان ماہرین علم النفس کے دلائل سے امور ذیل مستنبط ہوتے ہیں۔

مسلمان علماء کے دلائل کا خلاصہ

(۱) روح لطیفۂ عالمہ مدرکہ ہے۔

(۲) روح جسم لطیف ہے جو سارے بدن میں ساری ہے۔ جسم سے مراد مادی جسم نہیں بلکہ نورانی جسم ہے۔

(۳) جب بدن میں قابلیت مکمل ہو جاتی ہے تو خدا اس میں روح پیدا کر دیتا ہے، یعنی مخلوق و حادث ہے۔

(۴) بدن کے مٹ جانے اور فنا ہونے سے رُوح پر کچھ اثر نہیں پڑتا ہے۔ رُوح ہمیشہ تک باقی رہتی ہے۔

(۵) بدن رُوح کے لئے کسبِ کمالات کا آلہ ہے۔

(۶) رُوح دماغ نہیں ہے کیونکہ دماغ تبدیل ہوتا رہتا ہے، اور رُوح تبدیل نہیں ہوتی۔

انجیل جلیل کے رُو سے بھی رُوح غیر مادی ہے

ہم انجیل جلیل کے بہت سے اقتباسات رُوح کے متعلق ابحاثِ گذشتہ میں لکھ چکے ہیں۔ یہاں صرف ایک اور اقتباس لکھتے ہیں، جس سے بالوضاحت یہ ثابت ہوتا ہے کہ نفسِ ناطقہ مادی نہیں بلکہ غیر مادی ہے اور اس بحث کے آخر میں ایک اور آیت نقل کریں گے جس سے واضح ہوتا ہے کہ رُوح قدیم نہیں بلکہ مخلوق وحادث ہے۔

حضور کی صلیبی موت کے بعد پھر زندہ ہونے کے متعلق آپ کے شاگرد آپس میں گفتگو کر رہے تھے کہ :-

"یسوع آپ اُن کے بیچ میں آکھڑا ہوا اور اُس نے کہا السلام علیکم[1]۔ مگر اُنہوں نے گھبرا کر اور خوف کھا کر یہ سمجھا کہ کسی رُوح کو دیکھتے ہیں۔ اُس نے اُن سے کہا کہ تم کیوں گھبراتے ہو؟ اور کس واسطے تمہارے دِل میں شک پیدا ہوتے ہیں؟ میرے ہاتھ اور میرے پاؤں دیکھو

---

[1] ہنری مارٹن صاحب نے انجیل جلیل کے فارسی ترجمہ میں اس یونانی جملہ کا جس کا ترجمہ اردو والوں نے "تمہاری سلامتی ہو" کیا ہے۔ السلام علیکم کیا ہے، جو نہایت فصیح اور موزوں ترجمہ ہے۔ نیز پنجابی مترجمین نے بھی السلام علیکم ترجمہ کیا ہے (منہ)

کہ میں ہی ہوں۔ مجھے چھُو کر دیکھو۔ کیونکہ رُوح کے گوشت اور ہڈی نہیں ہوتی، جیسا مجھ میں دیکھتے ہو۔" (لوقا ۲۴ : ۳۶-۳۹)

خُداوند کا یہ فرمانا کہ "رُوح کے گوشت اور ہڈی نہیں ہوتی" اس امر پر دال ہے کہ رُوح غیر مادی ہے کیونکہ اگر رُوح مادی ہوتی تو اس سے گوشت اور ہڈی کا سبب کرنا جو مادی ہیں محال ٹھہرتا۔

رُوح کے حادث ہونے کے دلائل

رُوح کے حادث ہونے کے صدہا دلائل ہیں، جن کا فرداً فرداً ذکر کرنا زحمت اور اشکال سے خالی نہیں۔ لہٰذا ہم ذیل میں صرف تین دلائل لکھیں گے جو نہایت آسان ہونے کے ساتھ نہایت مستحکم اور یقینی ہیں۔

(۱) نفس ناطقہ بدن سے پہلے یعنی ازل میں ایک تھا یا بہت؟ اگر ایک تھا تو بدن میں آنے کے بعد بھی ایک ہی رہا یا نہیں۔ اگر نفس ناطقہ ازل میں ایک تھا اور بدن میں آنے کے بعد ایک ہی رہا تو باطل ہے، کیونکہ اس صورت میں جن باتوں کو زید جانتا ہے لازم ہے کہ ان کو بکر بھی جانے یعنی ایک فرد کے علم سے تمام افراد انسان کو علم حاصل ہو جائے، جو صریح البطلان ہے اور اگر بدن میں آنے کے بعد رُوح بہت بن جاتی ہے تو اس سے رُوح کے لاتعداد ٹکڑے ہو جاتے ہیں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ رُوح رُوح نہیں بلکہ جسم ہے، کیونکہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا جسم کا خاصہ ہے نہ کہ رُوح کا۔ لہٰذا رُوح نہیں بلکہ جسم قدیم ہے

حالانکہ تم کہتے تھے کہ رُوح قدیم ہے۔

اور اگر رُوح ازل میں بہت سی تھیں، تو یہ بہت ہونا نوع کے اعتبار سے تھا یا عوارض کے اعتبار سے۔ اگر نوع کے اعتبار سے تھا، تو یہ بتلاؤ کہ فلاں رُوح کی یہ نوعیت ہے اور یہ خصوصیت اور فلاں رُوح کی یہ اور فلاں رُوح کی وہ جو سراسر محال ہے اور اگر یہ بہت ہونا عوارض کے اعتبار سے تھا تو عوارض کا پیدا ہونا بغیر بدن کے محال ہے۔ چونکہ ازل میں ارواح بغیر بدن کے تھیں، لہٰذا عوارض کے لحاظ سے بھی ان کی کثرت محال ہے۔

(۲) اگر نفسِ ناطقہ ازل میں اور قبل از بدن موجود تھا تو وہ ازل میں معطّل (بیکار) تھا یا کسبِ کمال کرتا تھا۔ اگر معطّل تھا تو رُوح کا وجود عبث ہے، چونکہ وجود میں کوئی چیز معطّل نہیں ہوتی ہے، لہٰذا رُوح ازل میں موجود نہ تھی۔ اگر رُوح ازل میں کسبِ کمال کرتی تھی تو بدن میں اس کا آنا محال ہے، کیونکہ رُوح اس لئے بدن میں آتی ہے کہ اس کے ذریعہ سے کسبِ کمال کرے اور جب بغیر بدن کے رُوح کسبِ کمال کر سکتی ہے تو اس کے بدن میں آنے کی مطلق حاجت نہیں ہے۔

(۳) اگر نفسِ ناطقہ ازل میں موجود تھا تو نفسِ ناطقہ اور اس کے مبادی میں کسی قسم کا تعلق ثابت نہیں ہو سکتا ہے، کیونکہ ہر کمال اس کو ازل میں حاصل تھا۔ جب ہر کمال اس کو بدن سے قبل حاصل تھا، تو اس کو بدن کی ضرورت ہی نہیں رہی، اور بدن میں اس کا تصرف ضائع اور رائیگاں

ہے۔ چونکہ رُوح کا تصرّف بدن میں رائیگاں ثابت ہُوا، لہٰذا رُوح کا بدن میں آنا بہترین نظام کے منافی ہے اور محال ہے۔

انجیل جلیل کے رُو سے بھی رُوح قدیم نہیں ہے

جب ہمارے مُنجّی نے اپنے شاگردوں کو تبلیغ کے لئے مقرّر فرمایا تو اُن کو اُن تکلیفوں سے جو تبلیغ کی وجہ سے اُن پر آنے والی تھیں آگاہ کرتے ہُوئے فرمایا کہ :-

"جو بدن کو قتل کرتے ہیں اور رُوح کو قتل نہیں کر سکتے، اُن سے نہ ڈرو بلکہ اُسی سے ڈرو جو رُوح اور بدن دونوں کو جہنّم میں ہلاک کر سکتا ہے۔" (متّی ۱۰: ۲۸)

حضُور نے اس ارشادِ واجب الاعتقاد کے ذریعہ اس نکتہ کی طرف اپنے شاگردوں کو متوجّہ فرمایا کہ خُدا رُوحوں کا خالق اور مالک ہے، کیونکہ حقیقی معنوں میں مالک وُہ ہے جو اپنے مملوک پر جس طرح چاہے تصرّف کر سکے۔ رُوحیں چونکہ خُدا کی مخلوق اور مملوکہ ہیں، اس لئے اگر خُدا چاہے تو ان کو ہلاک کر سکتا ہے۔ اگر وُہ خُدا کی مخلوق اور مملوکہ نہ ہوتیں تو خُدا کا ان پر کوئی حق نہ تھا کہ ان کو ہلاک کرے یا ان پر حکومت کرے۔ چونکہ خُدا ان کو ہلاک کر سکتا ہے، لہٰذا وُہ خُدا کی مخلوق و مملوکہ ہیں۔

دماغ

دماغ کی ماہیت

دماغ اعضائے رئیسہ میں سے ایک عُضوِ رئیس ہے اور کھوپڑی کے جَوف میں واقع ہے۔ دماغ کا اوسط وزن ایک جوان مرد میں ۴۹½ اونس (تقریباً ڈیڑھ سیر انگریزی) ہے اور ایک جوان عورت میں ۴۴ اونس ہوتا ہے۔ لیکن بعض عالی دماغ اشخاص کے دماغ کا وزن ۶۳ بلکہ ۶۴ اونس تک ہوتا ہے۔ بالعموم انسانی دماغ کا وزن اس کے جسم کا ۱/۴۰ حصّہ ہوتا ہے۔ چالیس سال کی عُمر تک دماغ تکمیل کو پہنچتا ہے اور پھر اس عُمر کے بعد ہر دس سال میں تقریباً نِصف چھٹانک دماغ وزن میں کم ہوتا جاتا ہے۔

دماغ اور رُوح یا عقل

اس بات پر اکثر مباحث ہُوئے ہیں کہ جس طرح جگر کے ذرّات یا خلیّات کے فعل کا نتیجہ صفرا ہے یا جس طرح عضلاتی ریشوں کے فعل کا نتیجہ انقباض ہے، اسی طرح عصبی خلیّات یا دماغ کے فعل کا نتیجہ کیفیتِ ادراک یعنی عقل ہے۔ لیکن یہ مناسبتِ صادقہ یا مشابہتِ حقیقہ نہیں ہے، تاہم اتنا ضرور ہے کہ :-

(۱) مختلف حواس کے اظہار کا انحصار دماغی کارٹکس کے مخصوص و محدود مقامات کی صحت پر ہے۔

(۲) ایسی ادویہ مثلاً شراب و داروئے بیہوشی وغیرہ جن کا اثر مسلّم طور پر زندہ اجسام پر ہوتا، وہ کیفیت ادراکیہ یعنی عقل پر بھی اثر کرتی ہے۔
(۳) آفات یا امراضِ دماغیہ سے عقل ضرور مختل ہو جاتی ہے۔

دماغ رُوح کا آلہ ہے

افسوس تو یہ ہے کہ مادہ پرست فرقہ آلہ اور ذی آلہ یا واسطہ اور ذی واسطہ میں تمیز نہیں کر سکتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ دماغ عقل کے لئے ایک آلہ یا ادراک کا ایک واسطہ ہے۔ اگر آلہ میں کسی قسم کی خرابی یا فساد پیدا ہو جائے تو اس سے لازم نہیں آتا کہ ضرور ذی آلہ میں بھی خرابی یا فساد پیدا ہو۔ البتہ آلہ کی خرابی سے ذی آلہ کا مخصوص کام معطل یا محدود ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر کاتب کا قلم ٹوٹ جائے تو کاتب کی کتابت معطل یا ملتوی ہو سکتی ہے لیکن خود کاتب کی ذات میں کسی قسم کا خلل نہیں پڑ سکتا۔

چونکہ خود دماغ کو اپنے افعال کا کچھ علم نہیں ہوتا، اس لئے بالآخر یہی ماننا پڑتا ہے کہ دماغ رُوح یا عقل کا ایک آلہ ہے یعنی رُوح یا عقل ہی دماغ پر حکمران ہے، جس طرح مطبع کو جس میں مختلف علوم و فنون کی کتب طبع ہوتی ہیں، اشکال سطور مضامین و مسائل کا کچھ علم نہیں ہوتا جو کہ اس کے وسیلہ سے انجام پاتے ہیں۔ لہٰذا یہ بھی پریس کی طرح رُوح کا عقل کا ایک آلہ ہے۔

امریکہ کا مشہور فلسفی و ماہر نفسیات (سائیکالوجسٹ) پروفیسر ولیم جیمس اپنے ایک مشہور لیکچر میں کہتا ہے کہ :-

"ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ادراک کا انحصار دماغ پر ہے لیکن یہ کس مشاہدہ سے ثابت ہوا ہے کہ خود دماغ ادراک پیدا کرتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم دماغ کو ادراک کا واسطہ کہہ سکتے ہیں۔"

سر آلیور لاج جو زمانہ حاضرہ کے مشہور سائنس دان اور موجد تھے اپنی ایک کتاب میں لکھتے ہیں کہ:-

"دماغ عالم طبعی و نفسی کے درمیان ایک واسطہ ہے۔ طبعی عالم میں حرکت اور نفسی عالم میں خیال کی عملداری ہے اور وہ عضو جس کا نام دماغ ہے، دونوں کے درمیان ایک نامعلوم طریقہ سے ترجمانی کا کام دیتا ہے۔ ۱۸۵۸ء میں انگلستان اور امریکہ کا بحری تار بحر ظلمات میں ٹوٹ گیا لیکن کیا اس تار کے ٹوٹ جانے سے خود امریکہ و انگلستان کا وجود منقطع ہو گیا؟" ("مین اینڈ یونیورس" ص ۱۸۴ تا ۱۹۸)

اکتوبر ۱۹۰۷ء کے رسالہ ہبرٹ جرنل میں میک کول دماغ کی بحث میں لکھتا ہے کہ:-

"دماغ مثل دیگر اعضائے حواس مثلاً سامعہ و باصرہ وغیرہ کے صرف ایک آلہ ادراک ہے، لیکن جس طرح نہ خود آنکھ دیکھ سکتی ہے اور نہ کان سن سکتے ہیں، اسی طرح دماغ بھی مدرک نہیں ہے۔"

الغرض جس قدر انسانی تجربات و مشاہدات میں وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے اور یہ امر واضح تر ہوتا جاتا ہے کہ دماغی آفات و صدمات سے روح یا عقل مطلق متاثر نہیں ہوتی چنانچہ ڈاکٹر (MATT) ان لوگوں

کے متعلق جو گذشتہ جنگ عظیم میں کسی نہ کسی صدمہ کی وجہ سے گونگے ہو گئے تھے کہتا ہے کہ :۔

"اس کی کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ جن کے خیالات میں سرِ مُو فرق پیدا نہیں ہُوا ہے۔ بولنے سے عاری ہو گئے ہیں ؟ اگر وُہ بہرے نہ ہوں تو وُہ سب کچھ جو اُن سے کہا جاتا ہے سمجھ لیتے ہیں اور یہ امر واضح ہو چکا ہے کہ اس قسم کے واقعات میں اُن کی باطنی زبان پر اثر نہیں پڑتا ہے کیونکہ وُہ اپنے خیالات اور فقرات کو اچھی طرح لکھتے ہیں پس اُن کا گونگا ہو جانا کسی ایسے فتور کا نتیجہ نہیں جو اُن کی عقل میں پہنچا ہو۔ قوتِ سامعہ جو ہماری قوتِ گفتار کو برانگیختہ کرتی ہے غیر متاثر رہتی ہے لیکن تاہم وُہ بول نہیں سکتے ہیں۔ وُہ کانا پھُوسی کرنے، کھانسنے، سیٹی بجانے یا قہقہہ مارنے سے عاری ہوتے ہیں لیکن نیند کی حالت میں ایسے جُملے استعمال کرتے ہیں جن کو وُہ جنگ یا مورچہ میں استعمال کیا کرتے تھے بعض اوقات ایسے حالات میں ان کی قوتِ گویائی بحال ہو جاتی ہے۔ لیکن اکثر ایسا نہیں ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک شخص محض خواب میں لگاتار چلّایا کرتا تھا لیکن بیداری کی حالت میں اور ہسپتال میں داخل ہونے کے بعد آٹھ ماہ تک بول نہیں سکتا تھا۔" Raymond, 329

حافظہ کا تعلق دماغ کے ساتھ ہے یا رُوح کے ساتھ

زمانہ حاضرہ کی تحقیقات اور انکشافات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان کے بدن اور اس کے دل و دماغ کا ذرہ

ذرّہ متواتر تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ ہر ایک سات سال کے بعد انسان ایک نیا بدن اور نئے دماغ کا مالک بن جاتا ہے۔ بچپن کا دماغ جوانی میں اور جوانی کا دماغ بڑھاپے میں باقی نہیں رہتا ہے۔ میں خود اس وقت تک قریباً پانچ چھ بار اپنا بدن اور دماغ تبدیل کر چکا ہوں۔ باوجود اس قدر تغیّر و تبدّل کے "میں" جیسا تھا اب تک ویسا ہی ہوں، میری انانیت میں سرِ مو بھی فرق پیدا نہیں ہوا۔ پس اگر حافظہ کا تعلق دماغ کے ساتھ ہوتا تو کوئی انسان یہ دعویٰ نہ کر سکتا کہ میں سات سال پہلے موجود تھا اور نہ ہی سات سال سے پہلے واقعات اور حادثات کی اس کو یاد ہوتی، کیونکہ ان واقعات کا عکس جن ذرات پر مرتسم تھا، جب وہ ذرات ہی باقی نہیں رہے تو ان کی یاد کیسے باقی رہ سکتی ہے؟ چنانچہ سیک کول جن کا حوالہ ہم پہلے دے چکے ہیں، دماغ کی بحث میں لکھتا ہے کہ :-

"علم نفس میں یہ محقق ہو چکا ہے کہ اجزائے جسم کی طرح جوہرِ دماغ بھی تغیر پذیر ہے۔ یہاں تک کہ بچپن میں جن اجزا سے دماغ ترکیب پاتا ہے وہ جوانی میں بالکل فنا ہو کر نئے اجزا میں تبدیل ہو جاتے ہیں یہی حال جوانی کے اجزائے دماغ کا پیری میں ہو جاتا ہے۔ بایں ہمہ انسان وہی رہتا ہے جو پہلے تھا۔ اس لئے ایک ایسی شے کا وجود ماننا پڑتا ہے جو بالاستقلال قائم رہتی ہے اور ماضی و حال یکساں ادراک کرتی ہے۔

پلاطینس (Plotinus) کہتا ہے کہ :-

"جہاں تک حافظہ کا تعلق ہے بدن ایک رکاوٹ کا باعث ہے انسان کا بدن جو بدلتا رہتا ہے قوتِ حافظہ کو قوی کرنے کی بجائے ضعیف کر دیتا ہے۔ حافظہ کا تعلق روح کے ساتھ ہے۔"[1]

ریڈ (Reid) کہتا ہے کہ :-

اگر میرے خیالات، محسوسات، جذبات، وغیرہ ہمیشہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ تاہم میری انانیت ایک مستقل طور پر قائم رہتی ہے جس کو "میں" کہتے ہیں۔ (Intellectual Powers, Essay iii c. 4)

ڈاکٹر والس (Wallace) نے اپنی مشہور کتاب ڈارونزم (Darwinism) کے باب ۱۵ میں جہاں ارتقائے انسانی کے مسئلہ میں ڈارون سے اختلاف کیا ہے وہاں روح کے متعلق نئی طرز سے ایک دلچسپ بحث کی ہے۔ چونکہ مسئلہ ارتقا کے رو سے کسی شے کا یکایک پیدا ہونا تسلیم نہیں کیا جاتا، اس لئے ڈاکٹر موصوف کہتا ہے کہ عالم ذی حیات میں کم از کم تین منزلیں ایسی پیش آتی ہیں، جہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی جدید قوت یا علت نے ضرور اپنا کرشمہ دکھایا ہے۔ ان منازل سہ گانہ کی تشریح ہم ڈاکٹر موصوف کی اصلی عبارت کا ترجمہ کر کے ذیل میں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں :-

[1] بحوالہ Raymond, p. 325

[1] Enn IV—VII 15

پیدا ہوئے ہوں، جن کے ذریعہ سے علی العموم عالم ذی حیات اور نیز انسان کی جسمانی ترکیب کی تکمیل ہوئی۔ مادہ اور اس کی حرکت کے باعث غیر عضوی عالم سے ظہورِ انسان تک ارتقا کے یہ مخصوص منازل سہ گانہ صاف طور سے ایک نامعلوم عالم کے وجود کی شہادت دیتے ہیں یعنی ایک ایسا عالمِ روح جس کا یہ مادی عالم سراسر مطیع ہے۔ اس عالمِ روح کی ہم اُن عجیب و غریب پیچیدہ قوتوں کو معلق سمجھتے ہیں جنہیں کششِ ثقل، کششِ اتصال، قوتِ کیمیاوی اور کہربائیت کے نام سے یاد کرتے ہیں اور جن کے بغیر عالمِ مادی ایک لمحہ بھی اپنی موجودہ شکل میں قائم رہنا کیا معنی باقی ہی نہیں رہ سکتا ہے، کیونکہ بغیر ان قوتوں اور غالباً جوہرِ فرد کی قوتوں کے بغیر یہ امر مشکوک ہے کہ آیا مادہ خود بخود موجود ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس سے زیادہ یقین کے ساتھ ہم ان ترقی پذیر مظاہرِ حیات جو نباتی، حیوانی، انسانی یا بالفاظ دیگر حیاتِ غیر مدرکہ، حیات مدرکہ اور حیاتِ تعقل میں منقسم ہوتے ہیں اور جن میں صرف افاضۂ حیات کے لحاظ سے فرق مراتب پایا جاتا ہے۔ اس کو عالمِ ارواح سے متعلق کر سکتے ہیں۔"

(باب ۱۵ ص ۴۷۴ و ص ۴۷۶)

ریل گاڑی کی مثال

دماغ کے مسئلہ کی مزید وضاحت کے لئے ریل گاڑی کی مثال نہایت موزوں ہے۔ ریل گاڑی کے ان ڈبوں کو جو انجن کے علاوہ ہیں بدن سمجھ لیجئے اور انجن کو دماغ فرض کیجئے اور ڈرائیور کو روح تصور کیجئے تو دماغ اور روح

تعلق اچھی طرح سمجھ میں آجائے گا۔

انجن میں آگ بھی ہے پانی بھی ہے اور سینکڑوں پُرزے بھی لگے ہوئے ہیں، جن میں سے ہر ایک کا ایک مخصوص کام ہے۔ بعض پُرزے ایسے ہیں جن کی وساطت سے انجن متحرک ہو سکتا ہے اور بعض ایسے ہیں جن کے ذریعہ انجن اگر متحرک ہے تو ساکن ہو سکتا ہے۔ بعض رفتار کو تیز کرنے کے لئے اور بعض سست کرنے کے لئے ہیں۔ لیکن کیا انجن خود بخود متحرک ہو سکتا ہے؟ یا اگر متحرک ہو تو کیا خود بخود ٹھہر سکتا ہے؟ کیا وہ سگنل کے اشاروں کو سمجھ سکتا ہے؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ انجن کو متحرک کرنا اور اس کو ٹھہرانا، اس کی رفتار کو تیز یا سست کرنا اور مقررہ اوقات میں خاص خاص اسٹیشنوں پر کھڑا کر دینا، خطرے کو محسوس کرنا وغیرہ یہ تمام امور ڈرائیور کے متعلق ہیں۔ اگر ڈرائیور نہ ہو تو انجن ایک بیکار چیز ہے۔ یہی تعلق دماغ اور روح میں ہے کہ اگر روح نہ ہو تو دماغ محض ایک بیکار چیز ہے۔ یہ روح کا کام ہے کہ جیسا مناسب سمجھے دماغ سے کام لے اور اس کو ایک مفید چیز بنائے۔

الحیات بعد الممات

فصول ماسبق میں روح سے متعلق کوئی امر ایسا باقی نہیں رہا جس پر ہم نے عقلاً و نقلاً سیر حاصل بحث نہ کی ہو۔ اس فصل میں ہم اس پر بحث

کریں گے کہ بدن سے جُدا ہونے کے بعد رُوح باقی رہتی ہے یا نہیں۔ اگر باقی رہتی ہے تو کس حالت میں اور کہاں؟ لیکن قبل اس کے کہ ہم اس بحث کو شروع کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق سینچر مشن والوں کے عقائد ہدیۂ ناظرین کریں جو از قرار ذیل ہیں۔

سینچر مشن والوں کے عقائد

From "Bible Readings for the Home Circle"

"انسان میں زندہ رُوح نہیں ڈالی گئی تھی، بلکہ زندگی کا دم انسان میں ڈالا گیا تھا جس کی وجہ سے انسان زندہ بنا۔" ص۱۰۷

اس سوال کے جواب میں کہ "موت کے وقت مسیح کی رُوح کہاں گئی تھی" لکھتے ہیں کہ "مسیح کی رُوح قبر میں گئی تھی لیکن وہاں نہیں رہی بلکہ تین دن کے بعد وہاں سے نکلی۔" ص۱۰۱

From "Helps to Bible Study" pp. 32, 33

1. Eccl. 12 : 7. At death the body goes back to dust, the spirit returns to God who gave it. This spirit which returns to God is not sum entity which is capable of a conscious existence apart from the body but it is the breath of life."

2. "Acts 2 : 34. One thousand years after David had died. Peter declared that David was not in heaven. This proves that the righteous do not go to heaven when they die."

3. "Ps 17 : 15. David expected to go to heaven when he awoke from the sleep of

death on the resurrection morn at the coming of the Lord Jesus Christ."

4. "I Thess 4 : 16—17. The righteous do not go to heaven until the coming of Jesus Christ at the last day. I Thess. 2 : 19. John 14 : 3. All life after death depends on the resurrection."

5. "I Cor. 15 : 16—18. Without the resurrection the good people who have died are perished. This could not be true if they went to heaven when they died. If the righteous went to heaven when they died there would be no use for a resurrection. There could be no reason for Christ to come back to this earth the second time to gather his Saints. (John 14 : 3) if they had already gone to heaven at death. If the wicked go to hell fire at death, and the righteous to heaven at death, there is no use of a judgement day at the end of time, or for Christ to come to reward every man according to his works. Math. 16:27, Rev. 22 : 12. This idea of a person going to hell or heaven at death destroys the Bible doctrine of the resurrection, the coming of Christ, and the judgement at the last day. There is no text in the Bible which when rightly interpreted, teaches that any body goes to hell or heaven at death, because the Bible does not contradict its own teachings."

6. "Eccl. 3 : 20. All go to one place

at death, and that one place is the grave when all turn to dust again. John 30 : 23 John 5 : 28, 29. The Bible never speaks of the soul or spirit going out of the body at death to maintain or to become capable of maintaining a conscious existence somewhere else. Eight times the Bible speaks of the soul as going into the grave. Acts 2 : 31, Job. 3 : 18, 22, 28, 30, Ps. 30 : 3 ; 89 : 48 ; Isa 38 : 17."

7. "Ps. 146 : 3, 4. When a man dies, his soul is unconscious till the resurrection."

8. "Ps. 115 : 17. If the righteous went to heaven when they died, they would certainly be praising God now, but this text says that the dead praise not the Lord."

9. "Job. 14 : 21. The dead do not know anything about what takes place on the earth after they die, because they are unconscious. In the Bible, death is called a sleep 54 times. Thus we understand that the dead are unconscious, just as a person is unconscious who is in a deep sleep. The breath of life from God made Adam a living soul, a conscious being, and when that breath of life was taken away at his death, it would necessarily leave him to be a dead soul, an unconscious being, till the resurrection, when that breath of life or spirit is put back into him again."

موت کیا ہے؟ موت کے لغوی معنی خالی ہونے اور بے حس و حرکت ہونے کے ہیں۔ مثلاً "مَاتَ المکان۔" مکان رہنے والوں سے خالی ہو گیا۔" یعنی اس مکان میں اب کوئی نہیں رہتا ہے۔ "مَاتَتِ الرِّیحُ" ہوا ساکن ہو گئی۔ جب کہتے ہیں کہ مَاتَ فُلَانٌ۔ "فلاں شخص مر گیا۔" تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اس کا جسم رُوح سے خالی ہو گیا۔ یعنی اب اس میں رُوح نہیں رہتی ہے، اس لئے وہ بے حس و حرکت پڑا ہوا ہے۔

زمانۂ حاضرہ کی حکیمانہ تحقیقات کا خلاصہ بھی یہی ہے، کہ رُوح کے بدن سے جُدا ہونے کے سوائے موت کے اور کوئی معنی نہیں ہیں۔ چنانچہ مسٹر آلیور لاج زندگی اور موت کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ:۔

ایک عضوی چیز کو ہم اُس وقت زندہ کہتے ہیں جب کہ وہ مادہ کو ایک خاص صورت میں ڈھال دیتی ہے، اور اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے قوتِ مدافعت سے استعداد کرتی ہے۔ ایک عضوی چیز جب تک زندہ رہتی ہے اپنی ہیئت کذائی کو بربادی و تشات سے محفوظ رکھتی ہے۔

مادہ اور قوتِ مدافعت پر اختیار کے باقی نہ رہنے کا نام موت ہے بالفاظِ دیگر رُوح کا جسم سے قطع تعلق کرنے کا نام موت ہے۔ موت کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ رُوح یا جسم کا معدوم ہو جاتا ہے کیونکہ موت کے بعد رُوح باقی رہتی ہے اور مادی اجزا بھی کسی نہ کسی حالت میں باقی رہتے ہیں جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک جسم مر گیا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اس کے اجزاء منتشر

ہو گئے۔ لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک شخص مرگیا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اُس کی رُوح اُس کے جسم سے جُدا ہوگئی۔" یا جسم کو چھوڑ کر چلی گئی۔"

بعینہٖ یہی تعلیم بائبل مقدس کی ہے۔ چنانچہ مقدس یعقوب اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ " غرض جیسے بدن بغیر رُوح کے مُردہ ہے ویسے ہی ایمان بھی بغیر اعمال کے مُردہ ہے۔" (۲: ۲۶) " رُوحِ او بیروں مے رَود و او بخاکِ خود بر مے گردد۔" (زبور ۱۴۶: ۴)۔

الغرض جبکہ رُوح اُور بدن کے تعلق کے منقطع ہونے کا نام موت ہے، تو ان لوگوں کے نزدیک جو رُوح پہ یقین رکھتے ہیں، موت نہ تو کوئی ہیبت ناک چیز ہے اُور نہ وحشت ناک امر ہے، کیونکہ اس انقطاع کے بعد بھی ہماری انانیت اُسی طرح قائم رہتی ہے۔ جس طرح اس بدن میں جو رات دن متغیر و متبدل ہوتا رہتا ہے اُور جو ہر سات سال کے بعد مکمل طور پر تبدیل ہوتا جاتا ہے لیکن ان لوگوں کی حرمان نصیبی قابلِ صد ہزار رحم ہے جو رُوح کے منکر ہیں۔ چنانچہ ہم ذیل میں دو مشہور و معروف منکرانِ رُوح کا یاس نامہ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:۔

(۱) ہربرٹ اسپنسر (Herbert Spencer) جو ایک پکا بے دین تھا۔ جُوں جُوں بڈھا ہوتا جاتا تھا، اس خیال سے بہت گھبراتا تھا کہ موت فطرت کی اُن تمام مسرتوں کا خاتمہ کر دے گی جو حواسِ خمسہ کی وساطت سے حاصل ہوتی ہیں۔ چنانچہ ۱۹۰۲ء میں لکھتا ہے کہ:۔

" دماغ اُور تنفس کے پیچیدہ تعلقات پر غور کرنے کے بعد یہ دیکھتا ہوں

کہ تعقل کی ہستی کے لئے ہمارے پاس صرف دماغ کی شہادت ہے۔ لہٰذا ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ جب جسم کا نظام برہم ہوجاتا ہے تو تعقل بھی ختم ہوجاتا ہے لیکن یہ نتیجہ ایسا غیر مانوس اور گھنونا ہے، کہ موت کے وقت تعقل کے ختم ہونے سے ہماری ہستی کا علم بھی معدوم ہوجاتا ہے[1]۔"

(۲) ہکسلے (Huxley) جو ایک اور منکرِ خدا تھا، اپنے دوست (John Moray) کو ۱۸۸۳ء میں لکھتا ہے کہ :-

"یہ ایک عجیب بات ہے کہ جوں جوں میں بڈھا ہوتا جاتا ہوں اور قبر کے نزدیک پہنچتا جاتا ہوں، فنا کے خیال سے میرے اوسان خطا ہوتے جاتے ہیں۔ بعض دفعہ یہ خیال کر کے میں کانپنے لگتا ہوں کہ جس طرح میں ۱۸۰۰ء کی نسبت کچھ نہیں جانتا تھا، اسی طرح ۱۹۰۰ء کے متعلق بھی کچھ نہ جانوں گا کہ کیا ہو رہا ہوگا۔ ایسی حالت سے تو میرے لئے جہنم بدرجہا بہتر ہے۔" (کتاب بالا ص ۳)

اب ان بدقسمتانِ ازلی کے دلی اضطراب اور بے چینی کے یاس انگیز مقولوں کے بالمقابل ہم خدا پرستوں اور قائلینِ روح کے صرف دو مقولے ذیل میں درج کرتے ہیں، تاکہ دونوں فریق کے قلبی واردات کے جائزہ لینے میں سہولت ہو۔

مقدس پولوس فرماتے ہیں کہ "موت میرے لئے نفع ہے" (فلپیوں ۱: ۲۳)

---

[1] Personal immortality by A. Gordon James, p. 216.

ایک مسلمان شاعر نے کیا ہی خوب کہا ہے کہ :-

جنت میں روح، جسم ہے نیچے مزار کے
کشتی ہماری ڈوب گئی پار اتار کے

کیا موت روح کے لئے بے حسی یا خواب کی حالت ہے

اب غور طلب امر یہ ہے کہ جب روح جسم سے علیحدہ ہو جاتی ہے تو اس کا علم اور ادراک وغیرہ صفات بدستور باقی رہتی ہیں یا یہ صفات زائل ہو جاتی ہیں بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جب انسان مرتا ہے تو اس کی روح حالتِ بے حسی یا خواب میں پڑی رہتی ہے۔ چنانچہ ترتولیئن (Tertullian) سے ایک شخص نے سوال کیا کہ کیا ہم موت اور روزِ جزا کے درمیان سوتے رہیں گے؟ ترتولیئن نے جواب دیا کہ "کیوں؟ جبکہ روح انسانی بدن میں رہ کر نہیں سوتی، تو موت کے بعد کیونکر سوئے گی۔ سونا جسم کا کام ہے" "The Gospel of the Hereafter," p. 84. لیکن ٹیچر کے ماننے والے فلاسفروں کو کون سمجھائے کہ سونا جاگنا کھانا پینا وغیرہ اس قسم کی باتوں کا تعلق جسم کے ساتھ ہے نہ کہ روح کے ساتھ، کیونکہ روح غیر مادی ہے۔ غیر مادی، مادی صفات و خصائص کی حامل نہیں ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بائبل مقدس نے جب کبھی سونے کا اطلاق کیا ہے تو جسم پر کیا ہے نہ کہ روح پر۔ کیونکہ جسم سے روح جب علیحدہ ہو جاتی ہے تو جسم اسی طرح بے حس و حرکت پڑا رہتا ہے جس طرح کہ سونے کی حالت

ہیں۔ لہٰذا اسی سکون اور بے حسی کی حالت کو جو جسم پر طاری ہو جاتی ہے بائبل مقدس نے سونے سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن یہ فرقہ چونکہ روح کے وجود و ہستی کا قائل ہی نہیں ہے، اس لئے وہ روح کہہ کر جسم مراد لیتے ہیں جس پر ہم شروع میں بحث کر چکے ہیں۔ نیز ان کے عقائد نامہ نمبر ۱، ۶۷، ۷ بر صفحہ ملاحظہ ہوں۔

ایمانداروں کا یقین

میرا تو ایمان اور یقین ہے کہ جب تک روح اس بدن کے قید خانہ میں مقید رہتی ہے، اس کے تمام قوی علم اور ادراک محدود و محصور ہوتے ہیں۔ لیکن جس وقت اس جسمانی قید سے چھوٹ جاتی ہے، اس وقت اس کے قوی علم اور ادراک نہایت قوی اور وسیع ہو جاتے ہیں۔ وہ زمان اور مکان کی گرفت سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔ اگر وہ سعید روح ہے تو اپنے احباب اور متعلقین بلکہ دیگر نیک بندوں کے لئے دعا کرتی ہے۔ خدا سے سفارش کرتی ہے اور امداد پہنچاتی ہے۔ یہ صرف میرا ایمان اور یقین نہیں بلکہ تمام مقدسین تابعین اور تبع تابعین کا یہی ایمان اور یقین تھا۔ چنانچہ ہم ان بزرگان میں سے چند کے افکار از کتاب "The Gospel of the Hereafter" pp. 71–91. ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

مقدس سپریئن (Cyprian) شہید نے جو کارتھیج کے بشپ تھے اپنے دوست کارنیلیس (Cornelius) سے معاہدہ کیا کہ ہم دونوں میں سے جو پہلے مر جائے۔ وہ اس دوسرے کو جو اس دنیا میں

باقی ہے، اپنی دعاؤں میں یاد رکھے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ:۔

ہمیں چاہیئے کہ ایک دوسرے کا خاص لحاظ رکھیں اور ہمیشہ ایک دوسرے کے لئے دعا کیا کریں۔ محبتانہ اشتراک کے ساتھ ایک دوسرے کے مصائب و تکالیف کو دعا کے ذریعہ سے دفع کریں۔ ہم دونوں میں سے جو شخص خدا کی مرضی کے موافق پہلے اس دنیا سے کوچ کرے، اس کی محبت بدستور خدا کی حضوری میں بھی قائم رہے اور اپنے بھائی بہنوں کے لئے خدا کے فضل کے سامنے دعا کرنے سے کبھی دریغ نہ کرے۔

اوریجن Origen جو سینٹ سپرئین کے ہمعصر تھے کہتے ہیں کہ:۔

وہ تمام ارواح جو اس زندگی سے رہائی حاصل کر چکی ہیں، اُن سے جو دنیا میں باقی ہیں محبت کرتی ہیں۔ اُن کی نجات کے معاملہ میں اُن کی مدد کرتی ہیں۔ اُن کے لئے دعا کرتی ہیں اور خدا کے سامنے اُن کی سفارش کرتی ہیں چنانچہ مکابیوں کی کتاب میں لکھا ہے کہ "یہ یرمیاہ نبی ہیں جو ہر وقت لوگوں کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں۔"

سینٹ گریگوری نازیانزن (Gregory Naziazen) نے سینٹ باسل (Basil) کے جنازہ پر کہا کہ:۔

"یہ ہم سے ایسے جدا نہیں ہوئے کہ ہم سے بالکل قطع تعلق کریں بلکہ اب تک لوگوں کے لئے دعا کرتے ہیں۔"

سینٹ جیروم (Jerome) ایک عورت کو جس کی بیٹی فوت ہو چکی تھی تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:۔

تمہاری بیٹی خدا سے تمہارے لئے درخواست کرتی ہے اور میرے لئے میرے گناہوں کی معافی کے لئے گڑگڑاتی ہے۔"

ایک شخص وجی لینشس (Vigilantius) کو جو یہ کہتا تھا کہ مرنے کے بعد روحیں نہ تو دعا کرتی ہیں اور نہ سفارش، مقدس جیروم جھڑک کر کہتے ہیں کہ:-

"رسل اور شہدا، جب اس جسم میں مقید رہ کر دوسروں کے لئے دعا کر سکتے تھے تو اب وہ کس قدر زیادہ کر سکتے ہوں گے۔ ایک شخص یعنی حضرت موسیٰ نے چھ لاکھ آدمیوں کے لئے خدا سے معافی مانگی اور حضرت استیفان نے اپنے قاتلوں کے لئے خدا سے معافی مانگی، تو کیا اب خدا کی قربت میں پہنچنے کی وجہ سے اُن کی قوت کم ہو گئی؟"

اب غور فرمایئے کہ اگر ارواح بدن سے جدا ہونے کے بعد سو جاتیں یا بے حس ہو جاتیں تو وہ خدا سے کس طرح دعا اور سفارش کرتیں۔ پلاطینس جو ایک بہت مشہور فلاسفر تھا کہتا ہے کہ:-

"انسانی ارواح جب بدن سے جدا ہو جاتی ہیں تو یہ ضروری نہیں ہے کہ جدا ہونے کے بعد وہ بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچانے سے باز رہیں۔ بلکہ دیگر خدمات کے علاوہ وہ دوسری دنیا سے پیغام بھیجتی رہتی ہیں اور یوں وہ ثابت کر دیتی ہیں کہ دیگر ارواح کو بھی بقا حاصل ہے۔"

Enn IV : VII. 15. بحوالہ Raymond.

بائبل مُقدّس اور حیات بعد الممات

فصل گذشتہ میں مَیں نے صرف مسیحی بزرگانِ دین کے اقوال پیش کرنے پر اکتفا کیا تھا۔ اب مَیں بائبل مُقدّس سے چند ایسے حوالے نقل کروں گا جن سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ارواح مفارقتِ بدن کے بعد نہ تو سوتی ہیں اور نہ بے حس[1] ہو جاتی ہیں اور نہ اُن کی قوّت حافظہ معدوم ہو جاتی ہے۔ مَیں نے گذشتہ اوراق میں مُقدّس پولُس کا یہ قول نقل کیا تھا کہ :-

(۱) "موت میرے لئے نفع ہے" (فلپیوں ۱ : ۲۳)

اگر ارواح مفارقتِ بدن کے بعد سو جاتیں یا بے حس ہو جاتیں تو مُقدّس پولُس ہرگز یہ نہ فرماتے کہ "موت میرے لئے نفع ہے" کیونکہ نفع خدمتِ خلق میں ہوتا ہے نہ کہ سو جانے یا بے حس ہو جانے میں۔ نیز خدمت کے لئے علم اور عقل کا ہونا لازمی امر ہے ورنہ بے خودی کی خدمت طرفین کے لئے مضرت رساں ہے۔ پس مُقدّس پولُس کا یہ فرمانا کہ "موت میرے لئے نفع

---

[1] سپنجری فرقہ بھی کہتا ہے کہ بائبل مُقدّس میں لکھا ہے کہ قبر میں نہ تو خُدا کی یاد ہوتی ہے اور نہ اُس کی تعریف (دیکھو گذشتہ اوراق میں ان کا اعتقاد نامہ) ہم کہتے ہیں کہ بالکل سچ ہے کیونکہ قبر میں رُوح نہیں رہتی ہے جو خُدا کی یاد یا تعریف کرتی۔ قبر میں تو لاش رہتی ہے جو خاک ہو جاتی ہے اور خاک کس طرح خُدا تعریف کر سکتی ہے؟ چنانچہ حضرت داؤد فرماتے ہیں "جب مَیں گور میں جاؤں تو میرے خون سے کیا فائدہ؟ کیا خاک تیری ستائش کرے گی؟" (زبور ۳۰ : ۹)۔

ہے، بالصراحت اس پر دلالت کرتا ہے کہ مرنے کے بعد ارواح علم اور ادراک رکھتی ہوئی خدمتِ خلق میں مشغول رہتی ہیں۔

(۲) اور دیکھو وہ شخص یعنی موسیٰ و ایلیاہ اُس سے باتیں کر رہے تھے۔ یہ جلال میں دکھائی دئے اور اُس کے انتقال کا ذکر کرتے تھے جو یروشلیم میں واقع ہونے کو تھا" (لوقا ۹: ۳۰-۳۱)

آیاتِ مافوق خداوند کی صورت کے تبدیل ہونے کے واقعہ سے لی گئی ہیں، جن سے ذیل کے امور ثابت ہوتے ہیں۔

(ا) حضرتِ موسیٰ جو خداوند سے صدیوں پہلے فوت ہو چکے تھے، (استثنا ۳۴: ۵-۶)، بجسدِ عنصری خداوند کے پاس تو نہیں آ سکتے تھے۔ لہٰذا یہ اُن کی رُوح تھی جو خداوند کے پاس آئی تھی۔

(ب) حضرت موسیٰ کی رُوح کے آنے سے ثابت ہوتا ہے کہ ارواح نہ تو سوتی ہیں اور نہ ہی بے حِس ہوتی ہیں ورنہ حضرت موسیٰ کی رُوح کا آنا اور خداوند سے باتیں کرنا محال تھا۔

(ج) ارواح مفارقتِ بدن کے بعد سب کچھ جانتی ہیں اور پہچانتی ہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کی رُوح نے خداوند کو پہچانا اور اُن سے باتیں کیں۔

(د) ارواح کو آنے والے واقعات کا بھی علم ہوتا ہے۔ چنانچہ خداوند کے انتقال کا ذکر کرنا جو اب تک واقع نہیں ہوا تھا اس پر دلیل ہے۔

حضرت ایلیاہ کے ذکر سے اس لئے ہم مجتنب رہے کہ اُن کا

ذکر (۲-سلاطین ۲: ۱۱-۱۲) اُور حضرت حنوک کا ذکر (پیدائش ۵: ۲۴) بائبل مقدس میں اس انداز پر ہوا، کہ اُن کے آسمان پر بجسدِ عنصری چلے جانے پر بھی استدلال ہو سکتا ہے، اور اُن کی موت پر بھی۔ بہر حال دونوں صورتوں میں سے جو بھی واقع ہوئی ہو، سبیچری مشن کے عقیدہ کی تخریب کے لئے زبردست دلیل ہے۔

(۳) لعزر اور اُس کی موت کے بعد کے واقعات کو خداوند نے اس تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے اس فریب خوردہ فرقہ کا زیرِ بحث عقیدہ مکمل طور پر باطل ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہم اس واقعہ کو انجیل جلیل کی عبارت میں پورے طور پر ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

"ایک دولتمند تھا جو ارغوانی اور مہین کپڑے پہنتا اور ہر روز خوشی مناتا اور شان و شوکت سے رہتا تھا۔ اور لعزر نام ایک غریب ناسوروں سے بھرا ہوا اُس کے دروازے پر ڈالا گیا تھا۔ اُسے آرزو تھی کہ دولتمند کی میز کے جھوٹے سے اپنا پیٹ بھرے۔ بلکہ کتے بھی آکر اُس کے ناسور چاٹتے تھے، اور ایسا ہوا کہ وہ غریب مر گیا اور فرشتوں نے اُسے لے جا کر ابرہام کی گود میں رکھ دیا، اور دولتمند بھی مُوا اور دفن ہوا۔ اُس نے عالمِ ارواح کے درمیان عذاب میں مبتلا ہو کر اپنی آنکھیں اُٹھائیں اور ابرہام کو دُور سے دیکھا اور اُس کی گود میں لعزر کو۔ اور اُس نے پکار کر کہا کہ اے باپ ابرہام مجھ پر رحم کر کے لعزر کو بھیج کہ اپنی اُنگلی کا سرا پانی میں بھگو کر میری زبان تر کرے، کیونکہ میں اس آگ

میں تڑپتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا، بیٹا یاد کر کہ تُو اپنی زندگی میں اچھی چیزیں لے چکا۔ اور اُسی طرح لعزر بُری چیزیں۔ لیکن اب وُہ یہاں تسلی پاتا ہے اور تُو تڑپتا ہے اور ان سب باتوں کے سوا ہمارے تمہارے درمیان ایک بڑا گڑھا رکھا گیا ہے، ایسا کہ جو یہاں سے تمہاری طرف پار جانا چاہیں نہ جا سکیں اور نہ لوگ اُدھر سے ہماری طرف وار آسکیں۔ اُس نے کہا پس اے باپ، میں تیری منت کرتا ہوں تُو اُسے میرے باپ کے گھر بھیج۔ کیونکہ میرے پانچ بھائی ہیں تاکہ وُہ اُن کے سامنے ان باتوں کی گواہی دے۔ ایسا نہ ہو کہ وُہ بھی اس عذاب کی جگہ میں آئیں۔ ابراہیم نے اُس سے کہا کہ اُن کے پاس موسیٰ اور انبیاء تو ہیں اُن کی سُنیں۔ اُس نے کہا، نہیں اے باپ ابراہیم، ہاں اگر کوئی مُردوں میں سے اُن کے پاس جائے تو وُہ توبہ کریں گے۔ اُس نے اُس سے کہا کہ جب وُہ موسیٰ اور نبیوں ہی کی نہیں سُنتے تو اگر مُردوں میں سے کوئی جی اُٹھے تو اُس کی بھی نہ مانیں گے۔ (لُوقا ۱۶: ۱۸-۲۱)

واقعہ بالا میں سے ذیل کی باتیں ثابت ہوتی ہیں:-

(ا) رُوح ایک جُداگانہ چیز ہے۔ جس کو فرشتوں نے ابراہیم کی گود میں رکھ دیا۔ اگر رُوح کی کوئی ہستی نہیں تو فرشتوں نے کیا اُس کا جسم ابراہیم کی گود میں رکھا تھا؟

(ب) موت کے بعد ہی ایمانداروں کی ارواح دارالسرور میں اور گنہگاروں کی دارالعذاب میں چلی جاتی ہیں۔

(ج) ہُم روحوں کو اپنی راحت و عذاب کا احساس رہتا ہے۔

(د) ارواح ایک دُوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔

(ہ) ارواح کو دُنیا کی باتیں یاد رہتی ہیں۔

(و) ارواح کی قوّتِ حافظہ قائم رہتی ہے، چنانچہ اُس دولتمند شخص کی رُوح کو اُس کے گھر اور باپ اور پانچ بھائی یاد تھے۔

(ز) ارواح کو دُنیا والوں کی بہبُودی کا فکر رہتا ہے۔

(۴) بائبل مُقدّس میں حضرت داؤد علیہ السلام کے ایک عجیب فوق العادت واقعہ کا بیان ہے کہ کس طرح مُقدّسین کی ارواح نے بُت پرستوں کے بالمقابل اُن کی مدد کی۔ ہم اس واقعہ کو بائبل مُقدّس ہی کے الفاظ میں ذیل میں نقل کرتے ہیں:۔

"اور فلستی پھر چڑھ آئے اور رفائیم کی وادی میں پھیل گئے۔ اور جب داؤد نے خُداوند سے پُوچھا تو اُس نے کہا تو چڑھائی نہ کر۔ اُن کے پیچھے سے گھُوم کر تُوت کے درختوں کے سامنے سے اُن پر حملہ کر اور جب تُوت کے درختوں کی پھُنگیوں میں تجھے فوج کے چلنے کی آواز سُنائی دے تو چُست ہو جانا کیونکہ اُس وقت خُداوند تیرے آگے آگے نکل چُکا ہوگا، تاکہ فلستیوں کے لشکر کو مارے اور داؤد نے جیسا خُداوند نے اُسے فرمایا تھا ویسا ہی کیا اور فلستیوں کو جبع سے جزر تک مارتا گیا۔"

(۲۔ سموئیل ۵: ۲۲-۲۵ ، نیز دیکھو ۱۔ تواریخ ۱۴: ۱۳-۱۷)

آیاتِ مافوق میں تین باتیں ایسی ہیں جن کی تشریح و توضیح از بس

ضروری ہے وُہ تین باتیں یہ ہیں۔ (۱) رفائیم کے معنے (۲) وادیٔ رفائیم کی وجہِ تسمیہ (۳) موت کے درختوں پر چلنے والے کون تھے؟

حال میں جناب W. O. Oesterley صاحب ڈی۔ڈی نے اپنی مشہورِ آفاق کتاب میں (ارواحِ مُردگان اور اُن کی جائے قیام کے عنوان کے ماتحت) ان تینوں امور پر نہایت محققانہ اور مبسوط بحث کی ہے جس کا خلاصہ ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں اور مزید افادہ کے لئے اصل کتاب کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں۔

رفائیم۔ اوسٹرلی صاحب لکھتے ہیں کہ بائبل میں رفائیم کا اطلاق خاص کر گزرے ہوئے لوگوں کی ارواح پر ہوا ہے چنانچہ اوّل ہم ان تمام[1] آیات کو نقل کرتے ہیں جن میں یہ لفظ ہو بہو استعمال ہوا ہے۔

(۱) "مُردوں کی رُوحیں (رفائیم) پانی اور اُس کے رہنے والوں کے نیچے کانپتی ہیں"۔ (ایوب ۲۶: ۵)

(۲) کیا تو مُردوں کو عجائب دکھائے گا؟ کیا رفائیم اُٹھ کر تیری تعریف کریں گے؟" (زبور ۸۸: ۱)

(۳) "شیول (عالمِ غیر مرئی) نیچے سے تیرے سبب سے جنبش کھاتا ہے کہ تیرے آتے وقت تیرا استقبال کرے۔ وُہ تیرے لئے رفائیم کو یعنی زمین کے سب سرداروں کو جگاتا ہے۔ وُہ قوموں کے سب بادشاہوں کو

[1] مصنف صاحب نے بائبل مقدس میں سے بیس آیتیں نقل کی ہیں ہم نے بغرضِ اختصار صرف اُن کے شروع کی سات آیتیں نقل کی ہیں منہ ۔ اس آیت میں مُردوں اور مُردوں کی ارواح دونوں پر رفائیم کا اطلاق ہُوا ہے ۔ منہ۔

اُن کے تختوں پر سے اُٹھا کھڑا کرتا ہے۔ وُہ سب تجھ سے کہیں گے،
کیا تُو بھی ہماری مانند کمزور ہو گیا؟ تُو ایسا ہو گیا جیسے ہم ہیں؟"۔

(یسعیاہ ۱۴: ۹-۱۰)

(۴) وُہ جو مر گئے پھر زندہ نہ ہوں گے۔ رفائیم پھر نہ اُٹھیں گے

(یسعیاہ ۲۶: ۱۴)

(۵) "اُس کا گھر موت کی اُترائی پر ہے اور اُس کی راہیں رفائیم کو جاتی
ہیں"۔ (امثال ۲: ۱۸-۱۹)

(۶) "پر وُہ نہیں جانتا کہ وہاں رفائیم ہیں اور اس عورت کے مہمان
شیول کی تہ میں ہیں"۔ (امثال ۹: ۱۸)

(۷) "جو فہم کی راہ سے بھٹکتا ہے، رفائیم کے غول میں پڑا رہے گا"۔

(امثال ۲۱: ۱۸)

اِن سات آیتوں کے نقل کرنے کے بعد مصنّف موصُوف لکھتے ہیں
کہ اگر ان حوالجاتِ ما فوق کے ساتھ ہم فینیقی کتبوں Phounecian
Inscriptions میں سے اُن دو کتبوں کو نقل کریں جن میں لفظ رفائیم
استعمال ہُوا ہے تو رفائیم کے معنی سمجھنے میں ہمیں بہت مدد ملے گی۔ وُہ
دو کتبے یہ ہیں:-

(۱) تابنتھ (Tabnith) کے کتبہ (صیدان سن ۳۰۰ قبل مسیح)
میں یہ عبارت کندہ ہے کہ "اگر تُو مجھے (میرے تابُوت کو) برہنہ کرے اور

ـــــــــ

G. A. Cooke, North Sinnitic Inscription, pp. 26—36 لـه

تجھے پریشان کرے تو تجھے زندوں کے درمیان آفتاب کے نیچے نصیب نہ ہو، اور تجھے رفائیم کے ساتھ آسائش کی جگہ نصیب ہو۔"

(۲) اشمنزر (Eshmunzer) صیدان کے بادشاہ کے کتبہ کی عبارت جس کا زمانہ وہی ہے جو مافوق میں مذکور ہے یہ ہے۔

"ہر ایک اُس شاہزادہ کو اور ہر ایک اُس شخص کو جو اس آرامگاہ کو کھول دے گا یا اُس شخص کو جو تابوت کو میری اس آرامگاہ سے منتقل کریگا یا اُس شخص کو جو مجھے اس آرامگاہ سے کہیں اور لے جائے گا، رفائیم کے ساتھ راحت نصیب نہ ہو۔"

اس کے بعد مصنف موصوف لکھتے ہیں کہ آیاتِ مافوق سے ذیل کی باتیں معلوم ہوجاتی ہیں۔

"ارواح میں جو ش اور سمجھ پائی جاتی ہے۔ وہ خدا سے ڈرتی ہیں۔ ان کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اُٹھنے اور خدا کی تعریف کرنے کی قابلیت نہیں رکھتی ہیں، جو ان کی قبروں پر آتے ہیں۔ ان کو پہچان لیتی ہیں اور ان سے بات چیت کرتی ہیں اور اپنے متعلق بھی ان کو بتلاتی ہیں کہ ہم کمزور (لطیف) ہیں جو نادان ہیں، ان کی طرح ہیں۔"

ان دو مافوق کتبوں سے واضح ہوتا ہے کہ رفائیم کے ساتھ رہنا خوش نصیبی ہے اور ان سے علیحدہ رہنا عین بدقسمتی۔

رفائیم کا اشتقاق - رفائیم کے اشتقاق کے متعلق دو نظریات ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ اس لفظ کا مادہ ר פ א (رفہ) ہے جس کے معنی کمزور،

نازک، ضعیف کے ہیں۔ لیکن یہ نظریہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ بائبل مقدس کی اُن بیس آیات کو جن کو ہم نے نقل کیا ہے، اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو ان میں ایک بات بھی ایسی نہیں ملے گی جس سے ثابت ہو سکے کہ گذشتگان کی ارواح ضعیف یا نازک ہیں۔ اس کے برعکس بائبل مقدس سے بالوضاحت ثابت ہوتا ہے کہ گذشتگان کی ارواح ہر لحاظ سے زور آور ہیں۔ چنانچہ اسی وجہ سے[1] Necromancy کی بنیاد پڑ گئی۔

دُوسرا نظریہ یہ ہے کہ رفائیم مشتق ہے ۔ ר פ א (رفا) سے جس کے معنی شفا دینے، بہتر بنانے کے ہیں جو نہایت صحیح قیاس ہے، اس نظریہ کے مؤیدین یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ رفائیم کا اطلاق محض گذشتگان کی ارواح پر نہیں ہوا ہے بلکہ زمانۂ قدیم کے اُن لوگوں پر بھی ہوا ہے جو شہ زوری اور طاقت وری کے لحاظ سے دیو نژاد سمجھے جاتے تھے، چنانچہ ان کا ذکر سب سے پہلے پیدائش ۱۴: ۵ میں آیا ہے جس میں لکھا ہے کہ رفائیم جن کو کدرلاعمر نے اور بادشاہوں کے ساتھ مل کر فتح کیا تھا، اس وقت عشتارات قرنائیم میں رہتے تھے۔ (نیز مقابلہ کرو پیدائش ۱۵: ۱۸۔ ۲۰) اسی طرح اگر آپ یشوع کی کتاب ۱۲: ۴ و ۱۳: ۱۲ و ۱۷: ۸ اور استثنا ۲: ۲۰، ۳: ۱۱۔ ۱۳ وغیرہ آیات کو پڑھیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قوم جس کو رفائیم کہا گیا ہے نہایت طاقت ور اور زور آور قوم تھی۔ لہٰذا گذشتگان کی ارواح کو بھی نہایت طاقت ور ہونے کی وجہ سے رفائیم کہا گیا ہے۔

[1] ارواح کے ذریعہ نامعلوم امور دریافت کرنا (منہ)

وادیٔ رفائیم - بائبل مقدس میں ایسی آیتوں کی کافی تعداد موجود ہے جن سے وادیٔ رفائیم کی جائے وقوع کی تعیین و تخصیص ہو سکتی ہے۔ جس وادیٔ رفائیم کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ یروشلیم کے عین جنوب مغرب میں یعنی یروشلیم اور بیت لحم کے درمیان لیکن یروشلیم کے قریب تر واقع ہے۔

وادیٔ رفائیم کی وجہ تسمیہ :- اب سوال یہ ہے کہ یہ حصہ وادیٔ رفائیم کیوں کہلانے لگا؟ بائبل مقدس میں قریباً تمام مقامات کی کوئی نہ کوئی وجہ تسمیہ ہوتی ہے۔ اس کی بھی کوئی وجہ تسمیہ ضرور ہوگی اور اگر کوئی وجہ تسمیہ بالفرض نہ بھی ہو، تب بھی معمولی عقل کا شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس وادی کا تعلق ضرور رفائیم کے ساتھ ہے خواہ وہ رفائیم زمانہ قدیم کے جبابرہ ہوں یا ارواحِ گذشتگان۔

جو کچھ بھی آپ اس کے متعلق تصور کریں لیکن جب اس وادی کا نام رفائیم کے ساتھ پیوست کیا گیا، تو اس سے یہ شہادت ملتی ہے کہ گذشتہ لوگوں کو اس کے متعلق یہ یقین تھا کہ اس میں کچھ نہ کچھ غیر عادی امر ضرور ہے۔ چنانچہ بائبل مقدس میں اس وادی سے متعلق ایک امر غیر عادی کا ذکر ملتا ہے۔ (۲۔سموئیل ۵ : ۱۷ - ۲۵، ۱۔تواریخ ۱۴ : ۸ - ۱۷)

توت کے درخت پر کا واقعہ :- مصنف موصوف فرماتے ہیں کہ "توت کے درختوں کی پھننگیوں میں فوج کے چلنے کی آواز الخ" ایک عجیب آیت ہے۔ اس میں یہ فرض کیا گیا ہے کہ خود خدا توت کے درختوں میں یا توت کے درختوں پر ظاہر ہوا۔ یہ ممکن تو ہے لیکن ہمیں شک ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جیسے قدیم زمانہ سے لے کر اس وقت یہ یقین کیا جاتا ہے کہ مُردوں کی رُوحیں درختوں پر آتی ہیں تاکہ لوگوں کو مختلف اموُر میں مدد دیں۔ اسی قسم کا واقعہ یہاں بھی واقع ہُوا ہوگا۔

نتیجہ:۔ اس محققانہ اور دلچسپ بحث کے خاتمہ میں ادیسٹرلی صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

اس امر کے باور کرنے کی یقینی دلائل ہیں کہ اس وادی کا نام وادیٔ رفائیم اس عقیدہ کی بنا پر پڑ گیا کہ اس وادی کے ساتھ ارواح گذشتگان کا براہِ راست تعلق ہے۔

(۵) بائبل مُقدس میں شاؤل بادشاہ کا حضرت سموئیل کی رُوح کا بُلوانا اس قدر مشہور واقعہ ہے، جس کا صرف حوالہ دے دینا ہی کافی ہے جو یہ ہے ۱۔ سموئیل ۲۸: ۳-۲۱

نیچری فرقہ نے جب دیکھا کہ اس قسم کے واقعات سے اُن کے عقیدہ کی بُنیاد مُتزلزل ہو جاتی ہے تو مسیحیوں کے ناواقف طبقہ میں یہ کہتے پھرتے ہیں کہ یہ شیطان کی کارستانی ہے جو اپنی صُورت بدل کر دُوسروں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس فریب خوردہ فرقہ کو اتنا بھی علم نہیں کہ اگر حقیقت میں شیطان میں یہ قُدرت ہے کہ وُہ اپنی صُورت بدل لے اور نحو خیرہ کی شکل و صُورت میں بعینہٖ ظاہر ہو تو دُنیا سے امان اُٹھ جائے گا۔ ایک حشر برپا ہوگا اور ایسی ایسی خرابیاں پیدا ہوں گی جن کا انسداد ناممکن

ملہ ہندوستان کے ہندوؤں میں آج تک یہ یقین کیا جاتا ہے کہ پیپل وغیرہ درختوں میں ارواح رہتی ہیں۔ مترجم

ہوگا۔ نہ تو شوہر کو اپنی زوجہ کا اور نہ زوجہ کو اپنے شوہر کا یقین ہوگا بلکہ ہر شخص دوسرے شخص کے متعلق یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ وہ شخص نہیں ہے بلکہ یہ شیطان ہے جو اس کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ اب آپ بتلائیں کہ اس عقیدہ کی رو سے دنیا کی کیسی ابتر حالت بنے گی۔ اس لئے مسٹر Gerald Galloway جو روحانی پیغام رسانی کی مجلس تحقیقات کے ایک سربرآوردہ ممبر تھے۔ روحوں کا زندوں کے ساتھ تعلق رکھنے کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔

"یہ ناممکن نہیں ہے کہ ان سب امور کی کوئی فطری تشریح ہو۔ لیکن اس کہنے سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا کہ محققین کو معمول یا شیاطین فریب دیتے ہیں۔ محققین کل کے بچے نہیں ہوتے۔ وہ خود نہ صرف لائق ہوتے ہیں، بلکہ دھوکے بازوں کی فریب دہی کو طشت از بام کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ ایک نہایت خطرناک امر ہے کہ جس چیز کو ہم نہ سمجھ سکیں اس کو شیطان کی طرف منسوب کر دیں۔ مسیح کے دشمنوں نے بھی ایسا ہی کیا تھا، اور ہم جانتے ہیں کہ وہ غلطی پر تھے۔

روحوں کا زندوں کے ساتھ تعلق:۔ سلسلہ کلام کو قائم رکھنے کی غرض سے ذیل میں ایک مستند واقعہ نقل کرتا ہوں جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ارواح بعد از مفارقت بدن بھی زندوں کے ساتھ اپنے تعلقات قائم رکھتی ہیں:۔

ڈاکٹر جیمس صاحب لکھتے ہیں کہ "جنگ عظیم کے دنوں میں اگست

کی ۱۴ تاریخ صبح کو ایک مریض نے جو میرے زیرِ علاج تھا، اپنے نگران World Doctor سے کہا کہ مجھے یہ خواب دیکھ کر بے حد تشویش ہو رہی ہے کہ میرا بھائی فرانس میں مارا گیا ہے۔ پھر منگل کے دن ۲۱ اگست کو اُس نے مجھے کہا کہ میں نے پھر خواب دیکھا ہے کہ میرا بھائی مارا گیا ہے اور اس وجہ سے وہ بہت مضطرب تھا۔ ۲۴ اگست کو مجھے اس مریض کے باپ کی طرف سے اطلاع ملی کہ میں اُس کے بیٹے کو یہ اطلاع دوں کہ اُس کا بھائی لڑائی کے میدان کے زخموں کی وجہ سے ۱۴ اگست کو مر گیا۔ حالانکہ اُس کے آخری خط میں جو ۱۴ اگست کو گھر سے آیا تھا یہ لکھا تھا کہ وہ اچھی طرح سے ہے۔ میں یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں، کہ جب اُس نے مجھے ۲۱ اگست کو اپنے بھائی کی موت کے متعلق کہا تھا اُس وقت ایک اور سرجن بھی موجود تھا۔ میں نے اُس سرجن سے اور اُن سے جو اُس وقت غیر حاضر تھے یہ کہا تھا کہ ہمیں اس کا بیان لکھنا چاہیئے اور دیکھیں کہ کہاں تک اس میں صداقت ہے۔ World Doctor بھی اس سے ایک ہفتہ قبل کے خواب کی تصدیق کرتا ہے جس سے اس خواب کی مکمل تصدیق ہو جاتی ہے۔ میرے پاس سرجنوں کے دستخط بطور شہادت محفوظ ہیں۔"

The mind and the brain by Arthur Hadt. M. A. M. B. Surgeol Navy

اَرواح بعد از مفارقتِ بدن کہاں رہتی ہیں؟

اس سوال کا کہ اَرواح مفارقتِ بدن کے بعد کہاں رہتی ہیں؟ بائبل مُقدّس یہ جواب دیتی ہے کہ خُدا کے حضُور میں رہتی ہیں (واعظ ۱۲: ۷) جنّت فردوس اَور ابرہام کی گود کے معنی بجُز اس کے اَور کچھ نہیں کہ خُدا کی قربت اَور حضُوری میں رہنا۔ چنانچہ حضرتِ داؤدؑ فرماتے ہیں کہ "تیرے حضُور میں کامل شادمانی ہے۔ تیرے داہنے ہاتھ میں دائمی خُوشی ہے" (زبُور ۱۶: ۱۱)۔ پس خُدا کی حضُوری سے محرُوم رہنا اُس کی قُربت سے دُور رہنا سراسر ہلاکت اَور جہنّم ہے۔

ہمارے مُنجّی نے لعزر کا واقعہ بیان کرتے ہوئے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ رُوح جب بدن سے جُدا ہو جاتی ہے تو فی الفور یا تو دارالقرار میں جاتی ہے یا دارالبوار میں۔ لیکن سنیچری فرقہ یہ نہیں مانتا۔ چنانچہ ان کا عقائد نامہ اوراقِ گذشتہ میں بالتفصیل مذکور ہو چکا ہے۔ وُہ مُقدّس پطرس کے اس قول سے استدلال کرتے ہیں کہ "کیونکہ داؤدؑ آسمان پر نہیں چڑھا لیکن وُہ خُود کہتا ہے کہ:۔ (اعمال ۲: ۳۴)

کوئی ان عقل کے پُتلوں سے یہ تو پُوچھے کہ جس وقت حضرت داؤدؑ نے یہ کہا کہ "خُداوند نے میرے خُداوند سے کہا الخ" تو اس وقت حضرت داؤدؑ زندہ تھے یا فوت ہو چکے تھے؟ اگر کہو کہ فوت ہو چکے تھے تو بتلاؤ کہ یہ ایک

دسواں زبور کس طرح داؤد کا زبور کہلا سکتا ہے اور اگر کہو کہ زندہ تھے اور یقیناً زندہ تھے تو پھر تمہارا استدلال غلط ہے۔

کیونکہ راستبازوں کی ارواح بدن سے علیحدہ ہونے کے بعد آسمان پر جاتی ہیں نہ کہ زندگی میں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ایک نیا فرقہ ہے جن کو بائبل کے سمجھنے کے لئے ایک زمانہ چاہیئے۔ لیجئے میں ان کو مقدس پطرس کے قول مذکور کا مفہوم سمجھائے دیتا ہوں۔ مقدس پطرس حضرت داؤد پر خداوند کی فوقیت ثابت کرتے ہیں اور منطقی طور پر خداوند کی فوقیت پر استدلال کرتے ہیں کہ اس وقت جبکہ حضرت داؤد زمین پر تھے تو خداوند آسمان پر تھے۔ لہٰذا مسیح کی فوقیت ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت داؤد کے قول سے دلیل پیش کرتے ہیں کہ خدا نے میرے خداوند سے کہا الخ پس مقدس خداوند کی فوقیت کا ذکر کرتے ہیں نہ کہ حضرت داؤد کی روح کا۔

اب میں بائبل مقدس سے چند ایسے حوالے نقل کروں گا، جن سے بالصراحت ثابت ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد فی الفور راستبازوں کی ارواح جنت میں اور بدکاروں کی ارواح دوزخ میں جاتی ہیں۔

(۱) لعزر کا واقعہ جس کو ہم بالتفصیل گذشتہ اوراق میں نقل کر چکے ہیں۔

(۲) انجیل داؤد سے کہتی ہے کہ "اور گو انسان تیرا پیچھا کرنے اور تیری جان لینے کو اٹھے تو بھی میرے مالک کی جان زندگی کے بقچہ میں خداوند تیرا خدا کے ساتھ بندھی رہے گی۔ پر تیرے دشمنوں کی جانیں وہ گویا فلاخن میں رکھ کر پھینک دے گا۔" (۱ سموئیل ۲۵: ۲۹)

اس آیت میں زندگی کے نقشہ سے مُراد وہ جگہ ہے، جہاں نیکو کاروں کی ارواح رہتی ہیں۔ زیادہ تفصیل کے لئے "Immortality and the Unseen World" کے صفحہ ۱۵، صفحہ ۱۶ کو ملاحظہ فرمائیے۔

(۳) "کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جب ہمارا خیمے کا گھر جو زمین پر ہے گرایا جائے گا تو ہم کو خُدا کی طرف سے آسمان پر ایک ایسی عمارت ملے گی جو ہاتھ کا بنا ہُوا گھر نہیں بلکہ اَبدی ہے۔" (۲۔کرنتھیوں ۵: ۱)

(۴) "اور جب اُس نے پانچویں مُہر کھولی تو مَیں نے قُربان گاہ کے نیچے اُن کی رُوحیں دیکھیں جو خُدا کے کلام کے سبب اور گواہی پر قائم رہنے کے باعث مارے گئے تھے اور وہ بڑی آواز سے چلّا کر بولیں کہ اَے مالک، اَے قُدوس و برحق تُو کب تک انصاف نہ کرے گا اور زمین کے رہنے والوں سے ہمارے خُون کا بدلہ نہ لے گا اور ان میں سے ہر ایک کو سفید جامہ دیا گیا اور اُن سے کہا گیا اور تھوڑی مُدّت آرام کرو، جب تک تمہارے ہم خدمت اور بھائیوں کا بھی شمار پُورا نہ ہو لے جو تُمہاری طرح قتل ہونے والے ہیں۔"

(مکاشفات ۶: ۹-۱۱)

(۵) ان باتوں کے بعد جو مَیں نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہُوں کہ ہر ایک قوم اور قبیلے اور اُمت اور اہلِ زبان کی ایک ایسی بڑی بھیڑ جسے کوئی شمار نہیں کر سکتا، سفید جامے پہنے اور کھجور کی ڈالیاں اپنے ہاتھوں میں لئے ہُوئے تخت اور برّے کے آگے کھڑی ہے اور بڑی آواز سے چلّا

چلّا کر کہتی ہے کہ نجات ہمارے خُدا کی طرف سے ہے جو تخت پر بیٹھا ہے اور برّے کی طرف سے اور سارے فرشتے اُس تخت اور بزرگوں اور چاروں جانداروں کے گرداگرد کھڑے ہیں۔ پھر وہ تخت کے آگے مُنہ کے بل گر پڑے اور خُدا کو سجدہ کر کے کہا۔ آمین۔ حمد اور تمجید اور حکمت اور شکر اور عزّت اور قدرت اور طاقت ابدالآباد ہمارے خُدا کی ہو آمین، اور بزرگوں میں ایک نے مجھ سے کہا کہ یہ سفید جامے پہنے ہوئے کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟ مَیں نے اُس سے کہا کہ اَے میرے خُداوند تُو ہی جانتا ہے۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ یہ وُہی ہیں جو اُس بڑی مُصیبت میں سے نکل کر آئے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے جامے برّے کے خُون سے دھو کر سفید کئے ہیں۔ اسی سبب سے یہ خُدا کے تخت کے سامنے ہیں اور اُس کے مقدِس میں رات دِن اُس کی عبادت کرتے ہیں اور جو تخت پر بیٹھا ہے وُہ اپنا خیمہ اُن کے اُوپر تانے گا۔ اس کے بعد نہ کبھی اُن کو بھُوک لگے گی نہ پیاس، اور نہ کبھی اُن کو دُھوپ ستائیگی نہ گرمی، کیونکہ جو برّہ تخت کے بیچ میں ہے وُہ اُن کی گلّہ بانی کرے گا اور اُنہیں آبِ حیات کے چشموں کے پاس لے جائے گا اور خُدا اُن کی آنکھوں کے سب آنسو پُونچھ دے گا۔ (مکاشفہ ۷: ۹-۱۷)

(۶) "اُس نے اُس سے کہا مَیں تجھ سے سچ کہتا ہُوں کہ آج ہی تُو میرے ساتھ فردوس میں ہوگا۔" (لُوقا ۲۳: ۴۳) خُداوند اُن دو چوروں میں سے جو آپ کے ساتھ صلیب پر لٹکائے گئے تھے، ایک کو جو آپ پر ایمان

لایا تھا یہ بشارت دیتے ہیں کہ "آج ہی تُو میرے ساتھ فردوس میں ہوگا"۔ چونکہ اس سے اس فرقہ کے عقیدہ کا ابطال ہوتا ہے اس لئے یہ فرقہ کہتا ہے کہ یہ عبارت صحیح نہیں ہے بلکہ صحیح عبارت یہ ہے کہ "آج میں تجھ سے کہتا ہوں کہ تُو میرے ساتھ فردوس میں ہوگا" اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ مُقدّس پطرس کہتے ہیں کہ خُداوند فردوس میں نہیں بلکہ پہلے عالم ارواح میں گئے۔ (۱۔ پطرس ۳: ۱۹ و ۲۰) لہٰذا عبارت مروّجہ صحیح نہیں ہے اور عبارت ثانیہ صحیح ہے۔

مَیں اس سے قبل لکھ چکا ہوں کہ یہ فرقہ ایک نوآموز فرقہ ہے جس کو بائبل مُقدّس کے اسرار و غوامض کو سمجھنے کے لئے ایک طویل مُدّت کی ضرورت ہے۔ اُنہوں نے لفظ "میرے ساتھ" سے یہ سمجھ لیا ہے، کہ جس طرح دو شخص ایک مکان میں ساتھ ساتھ رہتے ہیں یا ساتھ ساتھ چلتے ہیں، اسی طرح یہاں بھی یہی مُراد ہے۔ اگر ان کا مطالعہ غائر ہوتا تو ان کو معلوم ہوتا کہ اس عبارت میں لفظ "ساتھ" ان معنوں میں استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ یہاں بمعنائے "حفاظت" و "حمایت" کے استعمال ہوا ہے۔ بائبل مُقدّس میں اس کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً حضرت حنوک کے متعلق لکھا ہے کہ "حنوک تین سو برس تک خُدا کے ساتھ چلتا رہا" (پیدائش ۵: ۲۲) تو کیا اس سے ہم یہ معنی لیں کہ ایک محدود غیر محدود کے ساتھ اسی طرح چلتا رہا، جس طرح کہ زید عمرو کے ساتھ چلتا ہے، ہرگز نہیں۔ کیونکہ یہ ممکن نہیں۔ بلکہ یہاں اس کے یہ معنی ہیں کہ حنوک

خدا کی حفاظت وحمایت اور اُس کی پناہ میں چلتا تھا۔ نیز دیکھو یسعیاہ ۴۹ : ۴-۷ تک آیتوں کو پس انہی معنوں میں خُداوند نے چور سے کہا کہ از بسکہ تُو مُجھ پر ایمان لاتا ہے ۔ اس لئے آج تُو میری حفاظت وحمایت میں فردوس میں ہوگا اور ہمارا ایمان ہے کہ وُہ اُسی دِن فردوس میں گیا ۔

فقط والسّلام

ضمیمہ

جُداگانہ شخصیت کی قدر و منزلت

مسیح کی تعلیم کہ خُدا زندوں کا خُدا ہے (مرقس ۱۲: ۲۶-۲۷) خروج کی کتاب کے الفاظ سے صرف قیامت کا اثبات مقصود ہے لیکن خُدا وند کے استدلال سے رُوحوں کا بقا اور خُدا کے نزدیک اس کی قدر و منزلت کا اثبات مقصد ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ "خُدا نہیں چاہتا ہے کہ کوئی رُوح ان چھوٹوں میں سے ہلاک ہو۔" "اور تُمہاری قیمت دو کوڑیوں سے خُدا کے نزدیک زیادہ ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔

عبرانی میں نیدہ کے لئے تشکیبہ۔ نوم۔ شاناہ۔ یا شین۔ یہ سب الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ جس طرح زندگی میں انسان کا جسم سوتا ہے اسی طرح جب رُوح اس سے جُدا ہوتی ہے تو وہ عارضی بلکہ دائمی طور پر سوتا ہے۔

نیا عہد نامہ میں KOLM a6 0dL (نیدہ) صرف ایک جگہ (۱۔ کرنتھیوں ۱۱: ۳۰) میں زمانۂ حال کے لئے آیا ہے (کمزوری کی وجہ سے بہت سے مرجاتے ہیں) باقی تمام جگہوں میں مضارع یا پرفکٹ صیغہ میں آیا ہے۔

اگر نیدہ سے مُراد رُوح کی مَوت ہوتی تو پولُس اپنے شاگرد کو ہرگز

یہ نہ لکھتا کہ "موت میرے لئے نفع ہے" (فلپیوں ۱: ۲۱) کیونکہ بے حس ہو جانے میں کوئی نفع نہیں بلکہ خدمتِ خلق میں نفع ہے۔

نیز مکاشفہ ۶: ۹ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شہیدوں کی ارواح زندہ ہیں۔

قیامت

اس میں کوئی شخص شک نہیں کر سکتا کہ مسیحیوں کا اس پر ایمان کہ قیامت کا دن جب آ جائے گا تو "بدن"[1] پھر جی اُٹھے گا۔ لیکن اس میں اختلاف ہے کہ بدن سے کیا مُراد ہے۔ آیا یہی بدن جس سے رُوح جُدا ہو جاتی ہے یا کوئی اَور لطیف بدن ہوگا۔

ہمارا موجُودہ بدن کیا ہے۔ مختلف کیمیاوی اجزا کا ایک مرکّب ہے جو رُوح سے علیحدہ ہونے کے بعد اس کے اجزا منتشر ہوں گے اَور کیمیاوی طریقہ پر بعض تو نباتات اَور بعض حیوانات اَور بعض دیگر حشرات الارض کے اندر جذب ہو کر ان کے اجزائے ترکیبی بنیں گے۔ اَور بطور اغذیہ دیگر بے حساب انسانوں اَور حیوانوں وغیرہم کے اجزا بنیں گے۔ پس ان اجزا در اجزا کو بغیر کسی ناص وجہ کے پھر ترتیب دینا عقل کے نزدیک قابلِ ستائش نہیں ہو سکتا۔

پس یہ سمجھنا کہ یہی جسم قیامت تک قبر میں پڑا رہتا ہے یا سوتا رہتا ہے اَور قیامت کے دن یہی جسم پھر زندہ کیا جائے گا، ایک ایسا وہم ہے جس کا ثبوت نہ تو عقل سے ملتا ہے اَور نہ ہی کتبِ مقدسہ سے ملتا ہے۔

---

[1] رسُولوں کا عقیدہ۔

انجیل جلیل میں صرف دو ایسی غیر مطابق آیتیں ہیں جن سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ اس موجودہ بدن کی جو دفن ہوا ہے قیامت ہوگی۔ اول مکاشفہ کی ۲۰: ۱۳ آیت ہیں جن میں لکھا ہے کہ:۔ "اور سمندر نے اپنے اندر کے مُردوں کو دے دیا" لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ آیت بھی ہے کہ "موت اور عالم ارواح (حادیس) نے اپنے اندر کے مُردوں کو دے دیا" جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے مُراد مُردہ ابدان کا جی اُٹھنا نہیں ہے۔ نیز ڈاکٹر چارلس صاحب کہتے ہیں کہ آیت مافوق میں جو لفظ "سمندر" آیا ہے، یہ غلط قرأت کا نتیجہ ہے۔ اس کی صحیح قرأت "خزائن" ہے جو ایک یہودی اصطلاح ہے جو راستبازوں کی ارواح کے ٹھہرنے کی جگہ پر اطلاق ہوتا ہے۔ اور حادیس کا اطلاق بدکردار ارواح کے جمع ہونے کی وجہ پر ہوتا ہے۔ دوم یوحنا ۵: ۲۴-۲۷ ہے۔ ان آیتوں میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس سے ثابت ہو سکے کہ "مُردے" سے مراد جسمانی مُردے نہیں بلکہ سیاق و سباق سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ "مُردے" سے مراد رُوحانی مُردے ہیں نہ کہ جسمانی کیونکہ جسمانی مُردے کچھ سن نہیں سکتے ہیں۔ البتہ ۲۸ ویں آیت میں لفظ "قبر" آیا ہوا ہے جس سے جسمانی مُردے مُراد لی جا سکتی ہے لیکن اس آیت کا اگر ۲۵ ویں آیت کے ساتھ مقابلہ کیا جائے تو مطلع ہو جاتا ہے کہ یہاں بھی "قبروں" سے مُراد زمینی قبر نہیں بلکہ بے ایمانی کی قبر سے مُراد ہے کیونکہ قبروں میں مُردے نہ تو اپنی اصلی حالت پر رہ سکتے ہیں اور نہ ہی آواز سُننے کی اُن میں طاقت ہے۔ بجز ان دو مشکوک

مقاموں کے انجیل جلیل میں اور کوئی ایسی آیت نہیں مل سکتی ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ یہی بدن جو دفن کیا جاتا ہے پھر زندہ ہو گا۔

بشپ گور صاحب جو نہ صرف چرچ آف انگلینڈ کے بشپ ہیں بلکہ ایک بلند پایہ عالم بھی ہیں "بدن" کی قیامت کے متعلق ۸ اگست ۱۹۲۴ء میں Church Times میں ایک بیان شائع کیا ہے جس کا خلاصہ از قرار ذیل ہے "میں بدن کی قیامت پر ایمان رکھتا ہوں لیکن نہ اس بدن کی قیامت پر جو دفن ہوا تھا۔ میں گوشت Flesh کی قیامت پر ایمان رکھتا ہوں لیکن نہ اُس گوشت کی قیامت پر جو سڑ گیا تھا اور مختلف عناصر میں تبدیل ہو گیا تھا اور مختلف انسانوں کے بدن میں داخل ہو گیا تھا۔ میں ایمان رکھتا ہوں ایک مادی بدن پر جو بعد از موت ملے گا۔ لیکن نہ اُس بدن پر جو مادہ کے ذرات سے مرکب ہو جس سے ہم کسی قدر واقف ہیں[۱]۔ ایک مہینے کے بعد یعنی ۵ ستمبر کو اسی اخبار میں ایک اور بلند پایہ مضمون شائع ہوا کہ انجیل جلیل کی یہ آیت کہ "گوشت اور خون آسمان کی بادشاہت کا وارث نہیں ہو سکتا ہے اور نہ فنا بقا کی وارث ہو سکتی ہے"۔ (۱۔کرنتھیوں ۱۵ : ۵۰)، اس خیال کی تردید کرتا ہے کہ اسی جسم کی قیامت ہو گی جو دفن کیا جاتا ہے بلکہ بدن سے مراد ایک اور بدن ہے جو لطیف اور جلالی ہو گا۔ چنانچہ مقدس پولُس اس سے اُوپر والی آیتوں میں اس کی تشریح کرتے ہیں۔

(۱۔کرنتھیوں ۱۵ : ۴۲-۵۱)

[۱] The Problem of the Future Life. p. 101

Printed at the Maktaba Jadeed Press, Lahore and Published
by Major E. P. Utarid (Retd.) General Manager,
The Punjab Religious Book Society, Anarkali, Lahore,

نقوش پریس، اُردو بازار لاہور